اُردو کا مقدمہ

پروفیسر غازی علم الدین

زبان پر کسی بھی زاویے سے کی جانے والی تحقیق، لسانی کہلائے گی خواہ اس کا تعلق زبان کے آغاز و ارتقا کے نظریات سے ہو، خواہ صوتیات و نحویات پر مشتمل ساختیاتی مطالعے سے ہو، خواہ املا، رسم الخط اور تلفظ سے ہو۔ علمِ زبان، موجودہ لسانیات ابتداءً انگریزی میں فلولوجی Philology سے موسوم تھی۔ یہی فلولوجی بعد ازاں علمِ لسانیات (Linguistics) کہلایا اور اسے اب علوم، کلچر اور مابعد جدید رجحانات کا لازمہ قرار دیا جا رہا ہے۔ اس نسبت سے لسانیات کا مطالعہ زبان و ادب کے ہر طالب علم کے لیے لازم قرار پاتا ہے۔ لسانیات کے قدیم تصور سے جدید تصور تک، تاریخی لسانیات سے عام لسانیات تک قدیم و جدید ادبی رجحانات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب "لسانی مطالعے" سے لے کر زیرِ مطالعہ کتاب "اردو کا مقدمہ" تک پروفیسر غازی علم الدین کے سیّال تحقیقی سفر کا نمایاں پہلو لسانی ہے۔ سر سید احمد خان، علامہ اقبال، قائد اعظمؒ، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، حمید اللہ خان ضیا اسلام پوری، سید انجم جعفری، جسٹس جواد ایس خواجہ، رضا علی عابدی، فاطمہ قمر، پروفیسر شریف نظامی اور پروفیسر غازی علم الدین تک محافظینِ اردو کی ایک طویل کہکشاں موجود ہے جس کا ہر ستارہ ضوفشاں ہے۔ ان تمام محسنینِ اردو نے ہر محاذ پر اردو کا مقدمہ ناقابلِ تردید شواہد اور محکم دلائل سے پیش کیا ہے۔ اردو دنیا ان کی معترف اور ممنون ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

اُردو کا مقدمہ

پروفیسر غازی علم الدین

اُردو کا مقدمہ

اشاعت : 2021ء

کتاب : اُردو کا مقدمہ

مصنّف : پروفیسر غازی علم الدین

ناشر : محمد عابد

قیمت : 500 روپے

مطبع : سلیم نواز پرنٹنگ پریس

Urdu Ka Muqaddama

By:

Prof. Ghazi Ilm-ud-din

Edition - June 2021

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد

+92-41-615359, 2643841, Cell:0300-6668284

email: misaalpb@gmail.com

شوروم

صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

پیارے نواسے

محمد مدثر طٰہٰ

کے نام

فہرست

پیش لفظ

اُردو مر چکی ہے لیکن اُن کے لیے نہیں جو زندہ ہیں۔ اُردو زندہ ہے لیکن اُن کے لیے نہیں جو مر چکے ہیں۔ پروفیسر غازی علم الدین کی اس کتاب کا ماحصل اس اختصار یے اور اس قولِ بلیغ میں مکمل طور پر سمٹ آیا ہے۔ کتاب میں شامل سات تحقیقی اور تنقیدی مقالات پروفیسر غازی علم الدین کے رتجگوں کا ریاض ہیں۔ ہر مقالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے خود مکتفی اور اپنی قومی زبان سے غیر مشروط محبت کا آئینہ دار ہے۔ مجھے تو کتاب میں شامل ہر مقالہ فکر کی صلابت اور اظہار کی استقامت کی مثال دکھائی دیا ہے۔

اسلام اور اُردو پاکستان کے بغیر زندہ رہے ہیں زندہ رہیں گے لیکن پاکستان اُردو اور اسلام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُردو اور پاکستان کا باہمی رشتہ وہی ہے جو انسانی زندگی میں روح کا جسم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُردو پاکستان کے وجود کا جواز بھی ہے اس کی بقا بھی۔ اُردو پاکستان کی سمتِ سفر بھی ہے منزلِ مقصود بھی۔ اُردو پاکستان کا نقطۂ اتصال بھی ہے نقطۂ کمال بھی۔ معروف صدا کار رضا علی عابدی نے اپنی کتاب 'اُردو کا حال' میں بڑی خوب صورت بات لکھی ہے:

"اُردو میرے ماتھے پر رکھی ماں کی ہتھیلی ہے۔ میرے آنگن میں بکھری

روشنی اور میرے چمن میں پھیلی خوشبو ہے۔ میرے سینے میں دھڑکتی زندگی ہے۔ یہ میرے وجود پر برستی ٹھنڈک ہے۔ یہ زبان راحت، چین،سکون، آرام اور آسائش کا آمیزہ ہے۔''

قومی زبان انسان کی سرشت میں ہوتی ہے،اس کے خمیر میں ہوتی ہے۔اس کے شعور،لاشعور اور تحت الشعور میں ہوتی ہے اور اس کے ذہن میں Programmed ہوتی ہے۔ ہزاروں سال کے ثقافتی ارتقا کے نتیجے میں،لکھے جانے والے انسان کے ثقافتی ڈی۔ این۔اے میں اس کی اپنی زبان کی کوڈنگ ہوئی ہوتی ہے لہٰذا اظہار، ابلاغ میں جو تفہیم اور سہولت انسان کو اپنی قومی زبان میں ہوسکتی ہے کسی بدیسی زبان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی تخلیقی اور اختراعی صلاحیتیں جس طرح اپنی زبان میں بروئے کار آتی ہیں کسی دیگر زبان میں قطعاً ممکن نہیں ہوتا۔

صَوت، حرف اور لفظ زبان کی بنیادی اکائیاں ہیں، انھی اکائیوں کی اساس پر جملے، پیرا گراف، مضمون اور مقالے کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ لفظ مکان کی طرح ہوتے ہیں جن میں معنی مکینوں کی طرح رہتے ہیں۔ بیشتر قلمکار لفظوں کے ویران شہر تعمیر کرتے ہیں صرف مکان ہی مکان، مکینوں کا کہیں پتا نہیں حالانکہ مکین موجود ہو تو مکان خود تعمیر کر لیتا ہے۔ کتاب میں شامل ایک مقالے کا عنوان ہے ''فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک'' اس تحریر میں محترم پروفیسر صاحب نے برمحل نشان دہی کی ہے کہ:

''نشرو اشاعت کے فنی اکتسابات میں جو چیز سب سے زیادہ زُود یاب ہے وہ لفظی صنعتوں کی یہی مذموم فراوانی، استعارات کی یہی شعبدہ بازی اور زبان کی یہی چرب کاری ہے جس کا آوازہ دنیا میں اتنا بلند ہے۔ نشرو اشاعت کی اس چمکیلی دنیا میں صحتِ بیان اور لفظوں کا محتاط استعمال عنقا ہو چکے ہیں۔ لفظوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت تصور کرنے کے بجائے کوئی گِری پڑی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ لفظوں کے اسراف کا ایسا غدر مچا ہوا ہے کہ الامان والحفیظ! بیش تر ادیب لفظوں کے تھوک بیوپاری نظر

آتے ہیں۔ ذرا غور و فکر کے ترازو میں ان کی تحریر تو لیے تو کلو بھر
لفظوں میں سے دس گرام معنی برآمد ہوتے ہیں'' (ص۔۱۳۔۱۴)

زبان اور رسم الخط ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا درست نہیں ہے بلکہ رسم الخط زبان کے لیے جِلد کی حیثیت رکھتا ہے۔ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر طرح سے مکمل زبان وہ ہے جس کے رسم الخط میں اُس زبان کی ساری اصوات کے نمائندہ حروف موجود ہوں۔اُردو کا رسم الخط اُردو کی تمام مروّجہ آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ رسم الخط کے حوالے سے پروفیسر غازی صاحب بہت حساس ہیں۔ اپنے مقالے ''اُردو کا مِلّی تشخص اور کردار'' میں رقم طراز ہیں:

''اُردو رسم الخط اپنی ایک مبسوط تاریخ رکھتا ہے۔رسم الخط قوموں کے لسانی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے ایک قوم کے مخصوص تہذیبی نقوش کا پتا چلتا ہے۔ زبان اور رسم الخط کی اہمیت اس حوالے سے دو چند ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں (زبان اور رسم الخط) قوموں کی تہذیبی اساس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا سبب ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی تشکیل و تزئین اور فروغ وارتقا میں زبان کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ ہر رسم الخط صوتی ادائی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کی معرفت ہی سے آوازیں ادا ہو سکتی ہیں۔ موجودہ رسم الخط عربی و فارسی اور اُردو کی آوازوں کا آلۂ اظہار ہے۔ اُردو کا موجودہ رسم الخط دنیائے اسلام کا رسم الخط ہے جس سے ہمارے دینی رشتوں کی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اُردو رسم الخط دل آویز ہے جو ایجاد و اختراع کے نئے نئے پہلوؤں سے مُزیّن ہے'' (ص۴۳)

ہمارے ہاں رومن رسم الخط اختیار کرنے کی وجہ کم کوشی اور لسانی مرعوبیت ہے۔ لسانی مرعوبیت تہذیبی غلامی کی اولاد ہوتی ہے۔ کتاب میں شامل مقالے ''اُردو کے

خلاف قیامت کی چال‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’خدانخواستہ اُردو کو رومن رسم الخط کا جامہ پہنا دیا گیا تو یہ ختم ہو جائے گی۔ اُردو کا رسم الخط چوں کہ قرآنی رسم الخط ہے اس وجہ سے بھی لوگ حروف و الفاظ سے مانوس ہیں۔ رومن رسم الخط جڑ پکڑ گیا تو لوگ فہمِ قرآن سے بھی دُور ہو جائیں گے۔‘‘ (ص۳۴)

رسم الخط پر بات ہو رہی ہے تو یہاں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ۳۱/اگست ۱۹۳۶ء کے پارلیمنٹری بورڈ کی مجلس دستور ساز کے مرتب کردہ منشور کی شق نمبر 11 کا حوالہ ناگزیر ہے جس سے رسم الخط کی اہمیت عیاں ہے۔ متعلقہ شق ہے ’’ اُردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت‘‘۔

وطنِ عزیز پاکستان علامہ اقبال کے احساسات اور خیالات کی تجسیم ہے۔ یہ اُن کی ذہنی کاوشوں کا جغرافیائی اظہار ہے۔ اُردو زبان کے حوالے سے علامہ اقبال بڑا واضح موقف رکھتے تھے۔ ’’اُردو کا مقدمہ‘‘ میں شامل ایک مقالے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

’’گاندھی نے اُردو رسم الخط کو قرآن کا رسم الخط قرار دیا اور تعصب کی بنا پر اُردو کو مسترد کر دیا مگر اقبالؒ نے اُردو کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ میری لسانی عصبیت میری مذہبی عصبیت سے کم نہیں ہے۔‘‘ (ص۱۱)

بلاشبہ زبان اپنے بولنے والوں کی اجتماعی نفسیات، تہذیبی اور اخلاقی سطح کی بھی آئینہ دار ہوتی ہے۔ زبان محض خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی یہ احساسات اور خیالات کے ساتھ ساتھ قومیت کی تشکیل بھی کرتی ہے۔ زبان وہ تعارفیہ ہے جس میں کسی قوم کی ثقافت، تہذیب،ادب اور مذہب کے تمام تر اصول قاعدے محفوظ ہوتے ہیں۔ بچے کو اس کی زبان بُھلا دیجیے، لامحالہ وہ اپنے دین،تہذیب اورادب سے بیگانہ ہو

جائے گا۔ نئی نسل کی یادداشتوں سے ان کی زبان محو کر دیجیے، اُن کا جُداگانہ وجود اور اُن کا قومی تشخص خود بخود نیست و نابود ہو جائے گا۔

کتاب میں شامل مضمون ''اُردو تو بے زبان ہے کس سے کرے سوال'' بھارت میں اُردو کی زبوں حالی پر عظیم اختر کا شہر آشوب ہے جو میرے لیے حاصل مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے تعصب، تنگ نظری اور اُردو دشمنی کے ضمن میں آنکھیں کھول دینے والی اس تحریر نے مجھے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ اس بصیرت افروز مقالے کا یہ اقتباس دیکھ لیجیے تاہم میرے نزدیک اس تحریر کا مکمل مطالعہ کیا جانا چاہیے:

> ''جناب عظیم اختر مسلسل کئی سالوں سے ہندوستان میں اُردو کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ وہ اُردو کے دفاع میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے علمی و ادبی جریدے ''گلبن'' اور دیگر کئی رسائل میں متواتر لکھ رہے ہیں۔ میں نے ''گلبن'' میں شائع ہونے والے ان تمام مضامین کو پڑھا ہے۔ یہ مضامین عظیم اختر کے دل کی آواز ہیں اور ہندوستان میں اُردو کی موجودہ صورتِ حال کے تناظر میں دردناک مرثیہ اور شہر آشوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ ہندوستان میں اردو کی صورتِ حال سے بے خبر ہیں ان کے لیے یہ مضامین کسی بھی بڑے انکشاف سے کم نہیں۔'' (ص ٦٢)

''اردو کا مقدمہ'' کے مصنف مستند لسان شناس ہیں۔ کتاب میں شامل مقالہ '' فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک'' میں برقیاتی ذرائع ابلاغ پر اُردو املا اور تلفظ کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ٹیلی وژن چینلز نے سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ اصول اور فارمیٹ اپنا لیا ہے کہ 'میم' سے شروع ہونے والے وہ الفاظ جن کے پہلے حرف پر پیش آتی ہو اُسے خواہ مخواہ زبر کے ساتھ پڑھا اور لکھا جائے مثلاً

مُثبت کو مَثبت، مُختص کو مَختص ،مُنتقم مزاج کو مَنتقم مزاج، مُنہدم کو منَہدم، مُنتخب کو مَنتخب اور مُنقطع کو مَنقطع وغیرہ۔''

''لفظ 'عظیم' کی عظمت، حُسن اور معنویت کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ اُردو زبان و ادب میں یہ ہمیشہ مُثبت معنوں میں آیا ہے۔ اِبلاغ اور نشر و اشاعت میں آج کل 'عظیم آتش زدگی'، 'عظیم المیہ' اور 'جنگِ عظیم' جیسی تراکیب ہماری سماعتوں سے ٹکراتی رہتی ہے اور ہماری نظریں بھی ان الفاظ پر پڑتی رہتی ہیں۔ اہلِ ادب پر عجیب سی بے حِسی چھائی ہوئی ہے کہ کسی نے بھی توجہ نہیں دلائی کہ 'بدترین آتش زدگی' 'بدترین المیہ' اور 'جنگِ بدترین' کہنے میں کیا مضائقہ ہے؟''

اس مقالے میں ایسی بہت سی برمحل مثالیں درج کی گئی ہیں جو املا اور تلفظ کے تعلق سے فاضل مصنف کے موقف کو واضح کرتی ہیں۔ اکثر ٹیلی ویژن اینکرز اور کالم نگار تکرارِ لفظی و معنوی کے مُرتکب ہوتے ہیں جس کے موزوں حوالے اس مقالے میں موجود ہیں اور مقالے میں باقر مہدی کے اس شعر کا حوالہ موضوعِ بحث کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے:

ذرا سنبھال کے لفظوں کو جوڑیے صاحب!
کہ اس مکان میں ایک عمر تک رہے گا کوئی

زبان کی تخریب در اصل اس کی تضحیک کے مترادف ہے۔ اُردو زبان کی نزاکتوں اور لطافتوں سے آگاہ ہمارے ممدوح پروفیسر غازی علم الدین نے ان مضامین و مقالات میں جا بجا لسانی تخریب کاریوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ اردو زبان و ادب کے ہر طالبِ علم بالخصوص اُردو اساتذہ کے لیے حواشی اور حوالوں سے مُزیّن ان مقالات میں واضح رہنمائی موجود ہے۔ ہر سطح کے اُردو اساتذہ کو 'اُردو کا مقدمہ' اپنی مستقل مطالعاتی ترجیحات میں شامل رکھنا چاہیے اور اس نورِ بصیرت کو عام کرنا

چاہیے تا کہ وہ زبان دانی کے ضمن میں نسلِ نو کی صحیح خطوط پر تربیت کر سکیں۔

زبان اعضائے نُطق یا اعضائے تکلم سے ادا کی جانے والی آوازوں (نُطقی / تکلمی) پر مشتمل ہوتی ہے گویا نطق کا اظہاری رُوپ زبان ہے جو ربِّ کائنات کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔اس کے بولنے (تلفظ) اور لکھنے (املا) میں بے احتیاطی نا قابلِ معافی جُرم ہے۔

زبان پر کسی بھی زاویے سے کی جانے والی تحقیق،لسانی کہلائے گی خواہ اس کا تعلق زبان کے آغاز و ارتقا کے نظریات سے ہو، خواہ صوتیات و نحویات پر مشتمل ساختیاتی مطالعے سے ہو،خواہ املا، رسم الخط اور تلفظ سے ہو۔

علمِ زبان، موجودہ لسانیات ابتداءً انگریزی میں فلولوجی Philology سے موسوم تھی۔یہی فلولوجی بعد ازاں علمِ لسانیات (Linguistics) کہلایا اور اسے اب علوم، کلچر اور مابعد جدید رجحانات کا لازمہ قرار دیا جارہا ہے۔ اس نسبت سے لسانیات کا مطالعہ زبان وادب کے ہر طالبِ علم کے لیے لازم قرار پاتا ہے۔ لسانیات کے قدیم تصوّر سے جدید تصوّر تک، تاریخی لسانیات سے عام لسانیات تک قدیم و جدید ادبی رجحانات کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ اپنی کتاب ''لسانی مطالعے'' سے لے کر زیرِ مطالعہ کتاب ''اُردو کا مقدمہ'' تک پروفیسر غازی علم الدین کے سیّال تحقیقی سفر کا نمایاں پہلو لسانی ہے۔ سرسید احمد خان، علامہ اقبال، قائد اعظمؒ، بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، حمید اللہ خان ضیا اسلام پوری، سید انجم جعفری، جسٹس جواد ایس خواجہ، رضا علی عابدی، فاطمہ قمر، پروفیسر شریف نظامی اور پروفیسر غازی علم الدین تک محافظینِ اُردو کی ایک طویل کہکشاں موجود ہے جس کا ہر ستارہ ضو فشاں ہے۔ ان تمام محسنین اُردو نے ہر محاذ پر اردو کا مقدمہ نا قابلِ تردید شواہد اور محکم دلائل سے پیش کیا ہے۔ اردو دنیا ان کی معترف اور ممنون ہے۔

راقم کے رفیقِ کار، اُردو زبان و ادب کے سچے پرستار ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے اس قطعے پر ان سطور کا اختتام کرنا چاہوں گا۔

کہیں ریشم کہیں اطلس کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنا ہے تری یاد کو ہر سُو رکھ دوں
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ نفاست، یہ ادا
جی میں آتا ہے ترا نام میں اُردو رکھ دوں

پروفیسر ڈاکٹر غفور شاہ قاسم
شعبۂ اُردو، ایف۔سی کالج یونیورسٹی، لاہور
یکم جون ۲۰۲۱ء

اُردو کا مِلّی تشخص اور کردار

زبان اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ [۱] انسانی شخصیت میں یہ ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ زبان نہ ہوتی تو شعر ہوتا نہ فلسفہ، سائنس ہوتی نہ نت نئی ایجادات، نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو۔ یہ حقیقت ہے کہ اچھی زندگی ہمیں زبان کے طفیل نصیب ہوئی ہے۔ قوّتِ تکلم انسانی شرف کا ایک امتیازی وصف ہے۔ یہ قوّت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ بعض اوقات اسے واحد امتیازی وصف کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ نطق یعنی قوت گویائی انسان اور حیوان کی ہم نوعی کے باوصف واحد وجہِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ زندہ انسان اور زندہ زبان میں اس قدر قریب کی مشابہت ہے کہ کسی زبان کو ''زندہ'' یا ''مردہ'' کہنا مجازی طور پر ہی نہیں، لغوی طور پر بھی درست معلوم ہوتا ہے۔ مسلسل حرکت اور رنگارنگی میں بھی یہ دونوں ایک دوسرے کے مثیل ہیں۔ قوّت تکلم کی اس اہمیت کے پیشِ نظر ہر مذہب نے اس کی تہذیب و اصلاح کو اپنی تعلیمات کا حصہ بنایا ہے۔ اسلام ہمہ گیر راہ نمائی کا مدّعی ہے اس لئے قوتِ اظہار کے اس شرف پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ذکرِ الٰہی جو قلب و نظر کا اطمینان [۲] ہے زبان ہی کا وظیفہ ہے اور ''حَصَائدِ اَلْسِنَہ'' [۳] اسی قوتِ اظہار کے غیر مناسب استعمال کو کہا گیا ہے۔

جس طرح انسان ابتداء ہی سے اپنے گرد پھیلی ہوئی کائنات پر غور وفکر کر رہا ہے اسی طرح اس کے اندر پھیلی ہوئی کائنات بھی اس کی توجہ کا مرکز ہے جس کے عجائبات گونا گوں اور اسرار لامتناہی ہیں۔ زبان بھی انھی اسرار میں سے ایک ہے۔ یہ بنیادی سوالات ہمیشہ ہی سے موضوعِ بحث رہے ہیں کہ روئے زمین پر انسان کب سے آباد ہے اور کیا انسانی زبان کی اصل ایک ہی ہے؟ اس کی ابتداء کیسے ہوئی اور کیسے پھیلی؟ اور پھر اس میں تغیرات کس طرح سے آئے؟ زبانوں کے کتنے خاندان ہیں اور کون کون سی زبانیں کس کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں؟ لہجے کیسے وجود میں آئے، معاشرہ کا زبان پراور زبان کا معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے؟ معاشرے کے مختلف طبقات کی زبانوں میں فرق کی نوعیّت کیا ہے؟ انسانی زبان اور فکر کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ زبان کے عناصرِ ترکیبی کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :

> ''زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چارستونوں کے استقلال پر منحصر ہے،قوم کا ملکی استقلال،سلطنت کا اقبال،اس کا مذہب اور تعلیم و تہذیب۔ اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائے گی یہاں تک کہ مر جائے گی۔''[۴]

ہر زبان کے ساتھ متعلقہ قوم کی تہذیب وتمدن اور تاریخ و روایات وابستہ ہوتی ہیں۔ ہر ملک کی قومی زبان اس کے قومی تشخص کی آئینہ دار ہوتی ہے۔قومی زبان اور قومی تشخص میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں اردو زبان و ادب کے ملیّ تشخص اور کردار کی نسبت جائزہ لیا جائے گا۔اس تحریر سے میری یہ ہرگز مراد نہیں ہے کہ اردو کے فروغ وا شاعت میں صرف اور صرف مسلمانوں نے ہی کام کیا ہے اور دوسری قوموں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ رتن ناتھ سرشار، مالک رام، نول کشور، منشی پریم چند، ہری چند اختر، تلوک چند محرومؔ، پنڈت دیاشنکر نسیم، سری رام، پنڈت

برج نارائن چکبست ، پنڈت برج موہن کیفی دتاتریہ ، کرشن چندر ، رام بابوسکسینہ ، منشی تیرتھ رام فیروز پوری، دیوان سنگھ مفتون ، فراق گورکھپوری، گیان چند ، آنند نرائن ملاّ، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مسز سروجنی نائیڈو کی اُردو زبان و ادب کے بارے میں خدمات سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے؟ لیکن امرِواقع یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوششیں تمام قوموں سے بڑھی ہوئی ہیں جس کی وجہ یہ تھی کہ کسی دوسری قوم نے اس زبان کو من حیث القوم نہیں اپنایا کیوں کہ ان کے پاس وسیلۂ اظہار کے لئے دوسری دیسی زبانیں بھی موجود تھیں جنھیں انھوں نے وقتاً فوقتاً استعمال بھی کیا ہے لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم ہندوستان کی سیکڑوں زبانوں میں سے صرف اسی ایک زبان پر قناعت کی اور اپنے خیالات کے اظہار کا واحد، بھرپور اور موٴثر وسیلہ بنایا۔

اسلام ایک طریقِ حیات ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ عربی زبان اسلامی احکامات کی امین ہے۔ اس لئے اس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لئے کلمات و مفردات کا ایک بحرِ زخار موجود ہے۔ جس نسبت سے یہ کلمات برصغیر کی مقامی زبانوں میں داخل ہوتے گئے اُسی نسبت سے ان کا عربی زبان سے قرب بڑھتا گیا۔ یہ اس اثرپذیری کا نتیجہ تھا کہ مقامی زبانوں میں عربی زبان کا لسانی بُعد ختم ہونے لگا اور آخر وہ وقت آیا کہ مسلم ہند کی زبان بھی مشرف بااسلام ہوگئی۔ اردو جو اسلامی ثقافت کی زندہ مثال ہے، عربی اثرات کا نتیجہ ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ عربی زبان نے اردو کی ساخت و پرداخت میں مادرانہ کردار ادا کیا ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، بنگلہ، کھڑی بولی اور دیگر تمام زبانوں کا اِحصاء کیا جائے اور ان کے مفردات کا ماخذ تلاش کیا جائے تو سیکڑوں نہیں ہزاروں الفاظ عربی الاصل نکلیں گے۔ عربی زبان و ادب سے رابطے اور دینِ اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں کثیر تعداد ان علماء و ادباء کی سرگرمِ عمل نظر آتی ہے جو برصغیر کی کوکھ سے پیدا ہوئے مگر عرب تہذیب و تمدن کو

اپنانے لگے اور دینِ اسلام کی تشریح و توضیح میں اپنی زندگیوں کو وقف کیے رہے۔ یہ ان اربابِ علم کی محنت کا ثمر ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے عوام اپنے دین سے محبت کرنے والے ہیں اور تہذیبی و تمدنی اقدار کے حوالے سے اپنے عرب بھائیوں سے بہت قریب ہیں۔''[۵]

برصغیر پاک و ہند میں ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ مقبولِ عام زبان اردو کی تشکیل ہے۔ اردو کی تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی حیثیت متعین کرتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں :

> ''اردو ہماری گزشتہ عروجِ عظمت کی تنہا یادگار یا سوگ وار ہے۔مسلمانوں نے نہ صرف اردو کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی تمام تدریجی اور ارتقائی منازل میں اِنھیں کا ذہن و دماغ کارفرما رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی معاشرت، ان کی ذہنی اور دماغی ترقی کی تنہا حامل ہے۔کسی قوم کی زبان اس کی قومی حیثیت کی علم بردار ہوتی ہے۔کسی قوم کے اوّلیں آثارِ انحطاط کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کی زبان پر نظر ڈالیے۔ آپ پر یہ حقیقت جلد منکشف ہوجائے گی کہ قومی زوال کی ابتداء ہمیشہ زبان کے زوال سے ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اثر سے تشخصاتِ ملّی تک فنا ہوگئے ہیں۔''[۶]

برصغیر کی زبانوں پر عربی و فارسی زبانوں کے براہِ راست اثرات اسی وقت سے شروع ہوگئے تھے جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ ان زبانوں میں رفتہ رفتہ عربی و فارسی کے الفاظ غیر شعوری طور پر داخل ہونے لگے جن کے وجود کا علم ہمیں اس وقت کے دیسی ادب کی ورق گردانی سے ہوتا ہے۔ ان اثرات کو قبول کرنے میں اردو زبان بھی اپنی دوسری معاصر زبانوں کے برابر کی شریک تھی۔ برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں نے جب اردو کو اپنے لئے چن لیا تو اس میں عربی وفارسی کے دخیل الفاظ کا حصہ بھی زیادہ ہوگیا۔مسلمان اپنا ایک جداگانہ مذہبی نظام اور ایک

مخصوص فلسفۂ حیات لے کر آئے تھے اور اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے خاص الفاظ اور اسالیبِ بیان کے ساتھ ساتھ مذہبی رسوم و عبادات وغیرہ کے لئے توحید، رسالت، صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، نماز اور روزہ جیسی کثیر تعداد اصطلاحات کا ذخیرہ بھی رکھتے تھے جسے انھوں نے اردو زبان میں بجنسہٖ منتقل کردیا۔ اس سے جہاں اردو بولنے والے مسلمانوں کو اپنی مذہبی تعلیم و تبلیغ میں مدد ملی، وہاں اردو زبان کا دامن بھی وسیع ہوگیا۔[۷]

برصغیر کے مسلمانوں کی اپنی سماجی زندگی کا ایک خاص نہج تھا اور زندگی کے کچھ رسوم و رواج اور کچھ تقاضے بھی تھے۔ پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی تقریبات، ختنہ، عقیقہ اور نذر نیاز کے طریقے اور نشست و برخاست کے قرینے تھے۔ وہ بعض ایسے کھانے کھاتے آئے تھے، بعض ایسے لباس پہنتے آئے تھے اور بعض ایسی اشیاء (ظروف اور فرنیچر وغیرہ) استعمال کرتے آئے تھے جن کی وضع قطع اور جن کے نام ہندوستان کے لئے بالکل نئے تھے۔ بعض ایسے قصے اور بعض ایسے واقعات کی یادیں تھیں جو ان کے ماضی اور وطنِ قدیم سے متعلق تھے اور جن سے اردو زبان اب تک بالکل ناآشنا تھی، اس لئے ان کے یہ سب نام اور یہ سب تلمیحات انھیں جوں کی توں اس زبان کے سپرد کرنا پڑیں تاکہ وہ ان کی یومیہ زندگی کی بھرپور کفالت کرسکے اور ان کے خواب اور بیداری کی مکمل طور پر امین بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی عکاسی اور ترجمانی کی اہل بنانے کے لئے اردو زبان کو عربی و فارسی کے کثیر تعداد الفاظ، اصطلاحات، محاورات، تلمیحات اور اسالیبِ بیان عطا کردیے۔ یہ بات صرف اردو زبان تک ہی ختم نہیں ہوئی بلکہ ان کوششوں کا سلسلہ اردو ادب تک بھی پہنچا اور وہ اس طرح کہ عربی و فارسی کا تمام عروض اردو میں منتقل کرلیا گیا۔ عربی و فارسی زبان کی تمام بحریں اردو نظم میں استعمال کی گئیں۔ مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا اضافہ کیا

گیا۔ شعری تنقید کا انداز مستعار لیا گیا۔ اصلاحِ زبانِ اردو کی جو کوششیں آج تک اساتذۂ اردو نے کی ہیں ان میں دیسی الفاظ کو کم کرنے اورعربی و فارسی الفاظ کو رائج کرنے پر پوری قوت صرف کی گئی۔ عربی و فارسی محاورات کا ترجمہ کرنے کی کوشش تو بہت سے شاعروں نے کی ہے۔ یہ سب کچھ اردو کو اس برصغیر میں عربی وفارسی کے حقیقی جانشین بنانے کے لئے کیا گیا کیوں کہ مسلمانوں کو ان زبانوں سے پیار ہے۔ مسلمانوں نے اردو کو اپنانے کے لئے عربی و فارسی میں موجود قریب قریب پورا مذہبی سرمایہ اس زبان میں منتقل کردیا۔ مسلمان علماء نے قرآن مجید کا اردو میں ترجمہ کیا اور تفاسیر لکھیں۔ قرآن و حدیث، فقہ، سیرت، تصوف، اسلامی فلسفے اور تاریخ کے سرمائے کو اردو میں منتقل کیا۔ سیرت پاک پر سیکڑوں کتابیں اردو میں لکھی گئیں۔ بزرگانِ دین کی سوانحِ عمریاں اور مسلمانوں کی تاریخیں نہ صرف ترجمہ ہوئی ہیں بلکہ اردو میں بھی خود نئے سرے سے لکھی گئی ہیں۔ اس قدر وافر مذہبی سرمائے کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے اردو زبان کو اپنے لئے منتخب کرکے اپنی پوری کی پوری متاعِ عزیز اسے سونپ دی ہے۔ [۸]

اردو زبان اپنی خصوصیات کی بنا پر جس درجہ ممتاز ہے اس کی مثال برصغیر پاک و ہند کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کرسکتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ دیسی زبانوں میں سے اردو ہی وہ اکیلی زبان تھی جسے اکبر راج میں اس کے محل والوں نے اپنا لیا تھا، جسے شاہ جہان نے ہندوستان کے کونے کونے تک پہنچادیا تھا اور جسے ۱۸۳۲ ء میں انگریزوں نے فارسی کی جگہ سرکاری زبان بھی بنادیا تھا۔ یہی زبان آج پورے برصغیر کی لمبائی چوڑائی میں سب زبانوں سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ اس میں جتنا اسلامی ادب موجود ہے اتنا عربی و فارسی میں بھی مشکل سے مل سکے گا۔ اردو میں جو کچھ مواد اسلامی علوم اورعربی و فارسی زبان وادب سے متعلق موجود ہے اس کی تہ میں مسلم ہند کی تاریخ اور تہذیب کے معتبر شواہد ملیں گے۔ مسلمانوں کے قیامِ حکومت کے ساتھ ہی ہندوستان

اسلامی علوم کا بڑا مرکز بن گیا۔ لاہور، ملتان، دہلی، گجرات اور لکھنؤ وغیرہ مراکز ایسے تھے جہاں ہندوستان اور بیرون ہند کے علماء وفضلاء علوم کی تحقیق و تدقیق میں مصروف ہوئے۔ یہ روایت صدیوں تک قائم رہی۔ اسی وجہ سے دہلی جو دارالسلطنت تھا، اس نے علمی اور تہذیبی ترقی کے اعتبار سے بغداد اور قرطبہ کو بھی دُھندلا کردیا۔ یہاں کے علماء کی تصانیف کا معیار کسی بھی ملک کی تصانیف سے کم نہیں۔ یہاں کے علماء کی فکری روایت بیرونِ ہند علماء کی فکری روایت سے بہت مستحکم رہی ہے۔ گزشتہ دور کے چند صاحبِ فکر بزرگوں جن میں سرسیّد احمد خان، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی، علامہ اقبال، سیّد سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ ممتاز ہیں، ان کی تصانیف کا مقابلہ اسلامی ممالک کے کسی عالم کی تصانیف سے کرلیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی اسلامی تفکیر کا کیا مرتبہ ہے۔

اسلامی ہند میں اردو کے فروغ کے حوالے سے ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''نئی زبان (اردو) میں اس شدید قسم کی کشش تھی کہ اس نے جلد ہی عوام میں قبولیت کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔ پھر مسلمان صوفیہ نے اس زبان کے ذریعے اسلام کو پھیلانا شروع کیا تو یہ اور بھی مقبول ہوگئی۔ یہاں تک کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک یہ ایک ادبی و علمی زبان کی حیثیت اختیار کرگئی اور ملک کے ہر صوبے اور ہر شہر میں سائنسی اور ادبی انجمنیں اردو کے نام سے کام کرنے لگیں لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں اردو کی یہ مقبولیت انتہاء پسند ہندوؤں کو انتہائی ناگوار گزری۔''[۹]

زبان اور رسم الخط کا تعلق بھی روح اور قالب سے کم نہیں۔ رسم الخط تلفظ کا تابع ہوتا ہے اور اس کا ہر حرف ایک جداگانہ آواز کی نیابت کرتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتداءً زبان صرف اصوات کا نام ہوتا ہے اور اشکال ثانوی حیثیت رکھتی ہیں لیکن حروف یعنی الفاظ کی تحریری شکلیں بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی کہ ان کی آوازیں۔ زبان اور

رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ اور پائندہ بناتا ہے اس لئے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ زبان رسم الخط کے بغیر مکمل نہیں ہوتی بلکہ ادھوری رہتی ہے۔ جس زبان کا اپنا رسم الخط نہ ہو اس کا دامن علم وادب کے خزانوں سے تہی رہ جاتا ہے۔ جس طرح روح اور جسم ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، بالکل اسی طرح زبان اور رسم الخط کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اردو اور اس کے رسم الخط سے ہمارا رشتہ بہت قدیم ہے۔ اردو صرف زبان کا نام ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی علامت بھی ہے۔ برصغیر میں اردو ہندی تنازع کا اصل محرک رسم الخط کی تبدیلی تھا۔ ہندو اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم الخط رائج کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے شان دار ماضی، معاشرتی روایات اور تہذیبی و ثقافتی سرمائے سے دست بردار ہونا پڑتا۔ اردو زبان کو قرآنی حروف کا لباس عطا کر دینے کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان بستے تھے وہ اپنے علاقے کی مقامی بولی بولتے ہوئے بھی اردو زبان کو اپنی تحریر کے لئے استعمال کرنے لگے کیوں کہ عربی رسم الخط سے مسلمانوں کی عقیدت بالکل فطری تھی۔ اس لئے اردو کا دائرہ اثر اس قدر وسیع ہوا کہ برصغیر کے گوشے گوشے میں اس کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پشاور سے ڈھاکا اور کشمیر سے راس کماری تک اس کے بولنے اور سمجھنے والے پیدا ہو گئے۔ چناں چہ اردو کی نشر و اشاعت میں اسلامیانِ ہند کی کوششوں کو جتنا دخل ہے اس سے اردو زبان کا کوئی مؤرخ انکار نہیں کر سکتا اور نہ اس حقیقت کو چھپا سکتا ہے کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اطرافِ ہند میں اردو زبان کے مختلف مراکز قائم ہوئے جن سے رفتہ رفتہ ترویجِ اُردو کی صوبہ جاتی تحریکوں نے جنم لیا اور کُل ہند انجمن ترقیٔ اردو کے علاوہ متعدد چھوٹے چھوٹے اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ [۱۰]

اردو رسم الخط اپنی ایک مبسوط تاریخ رکھتا ہے۔ رسم الخط قوموں کے لسانی مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس سے ایک قوم کے مخصوص تہذیبی نقوش کا پتا چلتا ہے۔

زبان اور رسم الخط کی اہمیت اس حوالے سے دو چند ہوجاتی ہے کہ یہ دونوں (زبان اور رسم الخط) قوموں کی تہذیبی اساس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کا سبب ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی تشکیل و تزئین اور فروغ و ارتقاء میں زبان کچھ نہ کچھ کردار ضرور ادا کرتی ہے۔ ہر رسم الخط صوتی ادائی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس کی معرفت ہی سے آوازیں ادا ہوسکتی ہیں۔ موجودہ رسم الخط عربی و فارسی اور اردو کی آوازوں کا آلۂ اظہار ہے۔ اردو کا موجودہ رسم الخط دنیائے اسلام کا رسم الخط ہے جس سے ہمارے دینی رشتوں کی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اردو رسم الخط دل آویز ہے جو ایجاد اور اختراع کے نئے نئے پہلوؤں سے مزین ہے۔ اس میں تخلیقی صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس رسم الخط کو اس کے لکھنے والوں نے اپنی جدّتِ طبع اور رنگینیٔ قلم سے مصوّری کا درجہ عطا کر دیا ہے۔

جب تک اردو زبان دیوناگری میں قلم بند ہوتی رہی، ہمالیہ کی فصیل پار نہ کرسکی لیکن عربی و فارسی رسم الخط میں منتقل ہونے کی دیر تھی کہ اسے ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر ایران و عربستان کی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے تعارف و ملاقات کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دیوناگری کے حصارِ آہنی میں قید رہنے والی زبان کو مسلمانوں کی بدولت آزادی نصیب ہوئی اور اُسے وہ پرِ پرواز مل گئے جن کے زور پر وہ آج دنیا کی زبانوں میں تیسرے نمبر پر شمار ہونے لگی ہے۔ چناں چہ ہندوستان سے باہر اردو کی ترویج و اشاعت بھی اس کے قرآنی رسم الخط کا ہی اعجاز تھا جس کے احسان سے یہ زبان تا قیام قیامت سبک دوش نہیں ہوسکتی۔[۱۱]

فورٹ ولیم کالج وہ واحد ادارہ تھا جہاں سب سے پہلے پنڈت للولال جی نے اردو ہندی تنازع کا آغاز کیا۔ انگریزوں کی پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' اُن کے روزِ اوّل سے ہی کارفرما تھی۔ چناں چہ آہستہ آہستہ انگریز نے نسلی، لسانی، مذہبی، فرقہ جاتی اور علاقائی تعصب کو بھڑکایا اور خاص طور پر علیحدہ خطہ، تہذیب و ثقافت

اورتمدّن و کلچر کے موضوع پر کتابیں لکھوائیں جنھوں نے ان تمام قسم کے تعصّبات کو بھڑکانے میں شعلۂ جوالہ کا کام کیا۔ ہندی زبان کو فورٹ ولیم کالج نے خاص وجوہات کی بنا پر ترتیب دیا۔ مشرقی زبانوں کے شعبے میں عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو شامل تھیں۔ ڈاکٹر جان ِگل کرِسٹ اس کے صدر تھے۔ برطانوی افسروں کو مقامی زبان کی تعلیم کے لئے مصنّفین اور مترجم مسلمان اور ہندو تھے۔ یہ کتابیں فارسی رسم الخط (نستعلیق) میں شائع کی گئیں۔ ایک ہندو مترجم للولال جی نے، جو گجرات کا برہمن تھا، بھگوت گیتا کا ترجمہ ''پریم ساگر'' کے نام سے کیا لیکن اس میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ فارسی اور عربی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ شامل کیے گئے اور فارسی رسم الخط کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا۔ اس کام پر مصنف کی بہت تعریف کی گئی کیوں کہ اس طرح ایک نئی زبان، جسے ہندوؤں کی زبان کہا جا سکے، کا راستہ کھل گیا تھا۔ ''پریم ساگر'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا اور بعد میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس نئی طرزِ تحریر کا، جسے ہندی کا نام دیا گیا، پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''جدید ہندی کا اس وقت کوئی وجود نہ تھا کیوں کہ اس زبان میں پہلے کوئی لٹریچر نہ تھا۔ پہلی دفعہ اسے بطور ادبی زبان کے استعمال کیا گیا تھا۔ کالج کے پروفیسروں نے للولال جی کی اس زبان میں، جس میں اردو لکھی جاتی تھی، کتابیں لکھنے کی حوصلہ افزائی کی۔ البتہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کی جگہ سنسکرت الفاظ استعمال کیے گئے۔ یہ نئی زبان ہندوؤں کی ضرورت کے مطابق خیال کی گئی۔ پھر اس میں عیسائی مشنریوں نے بائبل کا ترجمہ کرکے اسے مقبول بنایا۔ نیا انداز جسے ہندی کہا گیا اسے مقبول ہونے میں کافی عرصہ لگ گیا۔ درحقیقت جدید ہندی ۱۸۵۷ء کے بعد ہی اس قابل ہوسکی کہ لوگ اس پر توجہ دیں۔ صوبائی گورنر لوگوں کو اردو زبان کے استعمال سے منع کرتے

اور ہندی کی ترغیب دیتے کیوں کہ برطانوی حکومت ہندی کی ترویج میں بہت دل چسپی رکھتی تھی۔ اس طرح ہندی کے فروغ سے ہندوقومیت کو تقویت ملتی تھی۔'' [۱۲]

ہندوؤں کو اردو زبان اس لئے گوارا نہ تھی کہ اس کا ظاہری پیکر فارسی اور عربی تھا اور وہ مہاتما گاندھی کے بقول قرآن کے حروف اور اسلوب کا مالک تھا۔ یہ بات تکلیف دہ تھی کہ اردو ابجد کی شکل قرآن کی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ قرآن کے آثار باقی اور جاری رہنا گویا مسلمانوں کو باقی رکھنے کی گنجائش پیدا کرنا تھا۔ شیخ محمد اکرام ہندوؤں کی اردو سے مخالفت اور ناگواری کے حوالے سے لکھتے ہیں :

''زبان و ادب کے معاملات میں بھی ہندوتہذیب کے احیاء کے حامیوں کا رویہ اس سے کم امتیازی نہیں رہا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں 'فورٹ ولیم کالج' میں للولال جی اور اُن کے ساتھیوں نے نئی ہندی اس طرح ''پیدا'' کی کہ اردو زبان سے تمام عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور سنسکرت اور ہندی مآخذ کے الفاظ شامل کر لیے۔[۱۳] یہی وہ رویہ تھا جس نے ان عوامل کو جنم دیا جس کا نتیجہ ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مہاتما گاندھی جیسے نام ور انسان بھی اردو کی ثقافتی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ ۱۹۴۰ ء میں ناگ پور میں ہندی ساہتیہ سملین کے اجلاس میں انھوں نے کہا ''اردو کو مسلمان بادشاہوں نے ترقی دی۔ اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس کی پرورش کریں۔'' [۱۴]

اردو ہندی تنازع کے پسِ پردہ کئی مقاصد تھے۔ یہ تنازع بیک وقت مسلمانوں کے مذہب اور ثقافت پر ادبی میدان میں ایک بھرپور حملہ تھا۔ عربی کے الفاظ کے اخراج سے مسلمانوں کے مذہب کو نقصان پہنچانا مقصود تھا اور فارسی الفاظ کو خارج کرنے سے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ادب برائے زیست کو برصغیر سے رخصت کرنا مقصود

تھا۔ مسلمانوں کی تہذیب کو ختم کر کے ہندو تہذیب و ثقافت کو فروغ دے کر سیاسی بالادستی حاصل کرنا تھا۔ رسم الخط کے بدلنے سے مراد مسلمانوں کو جہالت کی تاریکیوں میں دھکیلنا مقصود تھا کہ وہ فکری طور پر منجمد ہو جائیں۔ اردو برصغیر میں مسلمانوں کی ثقافت کی زبان تھی۔ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اس کا ارتقاء برصغیر میں مسلمانوں کی آمد اور قیام کا مرہون منت تھا۔ یہ آہستہ آہستہ ترقی کر کے پورے برصغیر میں رابطے کی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی۔ جب یہاں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے لئے بھی اسے رابطے کی زبان تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چناں چہ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی زبان بنا دیا گیا۔ گویا یہ اقدام مسلمانوں کی ثقافتی اور سیاسی حیثیت کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ یہ بات ہندوؤں کو پسند نہ آئی۔ ہندوؤں نے دیکھا کہ انیسویں صدی کے پہلے ربع میں شاہ عبدالقادر دہلوی کے اردو زبان میں سادہ ترجمۂ قرآن کو بہت مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تو وہ جل بُھن گئے۔ بنگال اور بہار میں تبلیغی، اصلاحی اور علمی رسائل و کتب کی اشاعت پر وہ مزید سیخ پا ہو گئے۔ ہندوؤں کو یہ خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اردو کے ذریعے مسلمان اپنے دین اور اپنی روایات کے تحفظ کا اہتمام کر رہے ہیں لہٰذا انھوں نے اردو کو بھی مسلمانوں کی طرح ملیچھ قرار دے دیا۔

۱۸۶۷ء میں یو پی کے ہندوؤں نے اردو کے خلاف تحریک چلائی اور مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے اور دیوناگری رسم الخط کو سرکاری حیثیت دی جائے۔ اس تحریک کا بنیادی محرک اردو دشمنی اور ہندو ثقافت کی بالادستی منوانا تھا۔ سرسیّد احمد خان کے لئے یہ صورتِ حال پریشان کن ثابت ہوئی۔ سرسیّد ابتداء میں متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوب صورت دوشیزہ کی دو آنکھیں سمجھتے تھے لیکن ۱۸۶۷ء میں بپا ہونے والے ہندی اُردو تنازع نے ان کے خیالات میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ متحدہ قومیت کے مخالف اور

دوقومی نظریے کے زبردست حامی اور مبلّغ بن گئے۔ انھوں نے ہندوؤں کے مستقبل کے ارادوں کو بھانپ لیا۔ چناں چہ انھوں نے اس بات پر زور دینا شروع کردیا کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ قوم ہیں، انھیں اپنے مستقبل پر غور کرنا چاہیے۔ ان کا تعلیمی پروگرام اسی فکر کی ایک کڑی تھا۔ معروف بھارتی مسلم دانش ور اور بھارتی پارلی منٹ کے سابق رکن ڈاکٹر رفیق زکریا لکھتے ہیں :

''ہندی اُردو قضیہ دراصل ہندو اور مسلم دانش وروں کے مابین چھڑنے والی لڑائی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر یہ ایک لسانی قضیہ تھا لیکن اس کی وجہ سے دونوں فریقوں کے جذبات اس حد تک مشتعل ہوگئے تھے کہ ان کے مابین پائے جانے والے تعلقات پر شدید اور دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ مسلم سیاست پر اس کا نہایت ہی واضح اثر ہوا۔ اس کی وجہ سے وہ تمام تعلیم یافتہ مسلمان جو پہلے ہی سے نئ ابھرنے والی ہندو قیادت کے تعلق سے شکوک اور شبہات میں مبتلا تھے اس بار شدت کی ساتھ اپنے مستقبل کے تعلق سے خطرہ محسوس کرنے لگے۔ سرسیّد احمد خان نے تو اس سے بہت پہلے ۱۸۶۷ء ہی میں اپنے اعلیٰ عہدے دار مسٹر شیکسپیئر سے کہہ دیا تھا کہ ہندی کی حمایت کرنے والے ہندوؤں کی اردو مخالف تحریک کے بعد ہی انھیں اس کا یقین ہوگیا تھا۔ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے کسی مشترکہ عمل کی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ لہٰذا اب مسلمانوں کو خود ہی منظّم ہوکر اپنے قومی اثاثے کی حفاظت کرنی ہوگی۔''[۱۵]

۷رنومبر ۱۸۷۱ء کو گورنر بنگال نے بھاگل پور سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس موقع پر مولوی امداد علی نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے۔ بہاری تو پہلے ہی سے موقع کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے گورنر کو ''غیر ملکی'' زبان کی بجائے مقامی زبان کے اجراء کا مشورہ دیا۔ چناں چہ گورنر

نے صرف اردو زبان کی مذمت کرتے ہوئے اسے ''غیر ملکی'' زبان قرار دیا بلکہ وہ اردو کو نقصان پہنچانے کے اس قدر درپے ہوگیا کہ اس نے محکمہ تعلیم کو اردو کی نصابی کتب کی ممانعت کا حکم جاری کردیا۔ گورنر کے اس فیصلے کو حکومت کے دیگر اعلیٰ عہدے داروں نے ناپسند کیا۔ کلکتہ کے نیم سرکاری اخبار ''دی انگلش مین'' نے بھی گورنر کے اس فیصلے پر نقطہ چینی کی۔ [۱۶]

۱۸۸۲ء میں ''ہنٹر ایجوکیشن کمیشن'' کی تشکیل کے موقع پر ہندوؤں کو دوبارہ اردو زبان کو نقصان پہنچانے کا موقع میسر آیا۔ اس بار یہ فتنہ پنجاب اور یو پی میں اٹھا جہاں انجمنوں اور سوسائٹیوں نے کمیشن کو اردو کے خلاف لاتعداد میموریل پیش کیے۔ ایک مرتبہ پھر سرسیّد اردو زبان کی حفاظت کے لئے آگے بڑھے اور ہنٹر کمیشن کو یہ باور کرانے میں کام یاب ہوئے کہ یہ مسئلہ لسانی کی بجائے سیاسی رنگ اختیار کرچکا ہے۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں یو پی کے متعصب گورنر اینٹونی میکڈانل کو یو پی کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں ہندی اور دیوناگری رسم الخط کے اجراء کے متعلق ایک عرض داشت پیش کی گئی۔ میکڈانل مسلمانوں کے بارے میں سخت متعصب تھا اور اسے مسلمانوں سے غداری کی بو آتی تھی۔ اسی سبب اس نے گورنر جنرل کو لکھا کہ ''مسلمان برطانوی سلطنت کے لئے خطرہ ہیں اور ان کی سرکاری ملازمتوں میں مضبوط پوزیشن کو سیاسی طور پر جہاں تک ممکن ہو ختم کیا جائے۔'' لہٰذا اس نے مسلمانوں کو زک پہنچانے کی خاطر نہ صرف یو پی کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو کے علاوہ دیوناگری رسم الخط جاری کرنے سے متعلق ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک حکم جاری کیا بلکہ یہ بھی حکم دیا کہ آئندہ دفاتر میں مختلف اسامیاں پُر کرتے وقت صرف انھی لوگوں کو مقرر کیا جائے جو فارسی اور دیوناگری رسم الخط دونوں سے واقف ہوں۔ [۱۷] اُردو دشمنی میں سر اینٹونی میکڈانل کی ہندوؤں سے ہم نوائی ہندوستان کے مستقبل، ہندو مسلم اتحاد اور مسلمانوں کی زبان، ثقافت اور علمی ورثے کے لئے خطرناک تھی۔ چناں چہ ''مسلم کرانیکل'' اس بارے میں

یوں لکھتا ہے:

''یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ حالیہ برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پائے جانے والے تعلقات میں کوئی شے کشیدگی کا اس قدر باعث نہیں بنتی جتنی کہ وہ فاش غلطی جو زبان کے مسئلے میں سرانیٹونی میکڈانل سے سرزد ہوئی ہے۔'' [۱۸]

یو پی کے مشہور متعصب وزیرِتعلیم مسٹرسمپورنا نند نے اپنی اردو دشمنی کا بڑا سبب یہ بتایا تھا کہ ''جب میں گھر گیا تو میری لڑکی نے بھگوان کی بجائے خدا کہا'' اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ''خدا کی طرح اور بہت سے الفاظ جو مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے تعلق رکھتے ہیں آہستہ آہستہ غیرشعوری طور پر اردو زبان کے ذریعے ہندوؤں کے دماغوں میں داخل ہوگئے ہیں اور اس سے ان کے مذہبی عقائد کے متاثر ہونے کا خطرہ ہے۔''[۱۹]

مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس میں مسلمان نمائندوں نے یہ فریاد پیش کی کہ بمبئ کے ناظم تعلیمات نے مراسلہ جاری کیا ہے کہ پبلک کے سکولوں میں سے اردو کو الگ کردیا جائے۔ اگر مسلمان اردو کی تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو دینی تعلیم کی طرح اس کا اہتمام اپنے گھروں پر کریں۔ اس طرح گویا اعلان کردیا گیا کہ ہندوؤں کا جس طرح اسلام سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح اردو سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ [۲۰] بہار کے صوبے میں اردو میں تحریر کردہ عرضی عدالتوں میں قبول کرنے سے انکار کردیا گیا۔ مسلمان وکلاء اور دیگر اکابر نے ایک التجائی مہم شروع کی جس کی تائید ۱۹۲۵ء کے سالانہ جلسہ مسلم لیگ میں کی گئی۔ [۲۱]

۱۹۳۷ء میں کانگریسی وزارتوں کی تشکیل ہوئی تو تمام ہندوصوبوں کے وزراء اعلیٰ، برہمنوں کو بنادیا گیا۔ اب یہ حال ہوگیا کہ ڈاک خانے والوں نے اردو میں تحریرکردہ منی آرڈر بھی قبول کرنے سے انکار کرنا شروع کردیا اور اُن خطوط کو

مکتوب الیہ تک پہنچانے سے انکار کردیا جن پر اردو میں پتا لکھا ہوتا۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں کانگریسی وزارتوں کو ملک کے لئے ایک مصیبت قرار دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں بندے ماترم، ودیا مندر سکیم اور کانگریسی جھنڈے کو قومی حیثیت دینے کے خلاف مسلمانانِ ہند کے نفرت انگیز جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور ان کی سیاسی قوت کو تباہ کرنے کے لئے اردو کومٹایا جارہاہے اور اس کی بجائے ایک ایسی زبان کو ہندوستان کے عوام کی زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو سنسکرت کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے۔'' [۲۲]

کانگریسی وزارتوں کے دوران (۱۹۳۷-۳۹ء) مسلمانوں کے وجود، ثقافت اور زبان کو ختم کرنے کی بھرپور عملی کوششیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے دیہات پر ہندوؤں نے منظّم حملے کیے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ دیہات جلادیے گئے۔ گھروں کو لوٹ لیا گیا اور پھر مسلمانوں پر جھوٹے مقدمات قائم ہوئے۔ انصاف کے دروازے ان پر بند کردیے گئے۔ مسلم پریس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ہندوؤں نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں کی ثقافتی زبان اردو کو ختم کردیا جائے۔ چناں چہ اردو کتابوں پر پابندی لگادی گئی۔ اردو سکولوں کو بند کیا جانے لگا۔ ایک طرف مسلمانوں کے ہر ثقافتی نشان کو مٹانے کی ہر ممکن عملی کوشش کی جارہی تھی جب کہ دوسری طرف ہندومت اور ہندو ثقافت کے ہر نشان کو ابھارنے کے لئے ہر ممکن قدم اُٹھایا جا رہا تھا۔ اس امر کی شدت کا احساس گاندھی کے اس بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> ''ہندوستان میں ہندوتہذیب کے ذریعے سوراج قائم ہوسکتا ہے۔ دھرم کی روشنی میں ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیم کو دنیا سے نابود کردیا جائے اور اس کی جگہ راشٹر دھرم کی تعلیم مسلمانوں کودی جائے۔ میں مسلمانوں کی گولی سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں تو ان کی زبان یعنی

اُردو سے جو برصغیر میں ان کی ثقافت اورتہذیب کی زبان ہے۔ اگر مسلمانوں کوختم کرنا ہےتو پہلے ان کی زبان ختم کرو، ان کی ثقافت اور تہذیب خود بخود ختم ہوجائے گی۔''[۲۳]

اس کے جواب میں قائداعظم محمدعلی جناح نے ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے موقع پرتقریر کرتے ہوئے ببانگِ دہل فرمایا تھا:

''ہندو اسلامی ثقافت وتہذیب اور اردو زبان کو مٹانے پر تلے بیٹھے ہیں لیکن میں ان کو خبردار کرتا ہوں کہ ہم مرتے مر جائیں گے لیکن اسلامی تہذیب وثقافت اور اردو زبان تباہ نہیں ہونے دیں گے۔''[۲۴]

پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس کے لئے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی خاطر مسلم ماس کانٹکٹ (رابطہ مسلم عوام) کا شعبہ قائم کیااور اعلان کردیا کہ اب کانگریس جناح سے کوئی بات چیت نہیں کرے گی اور اس کی بجائے وہ براہِ راست مسلمان عوام کے پاس جائے گی اور انھیں بہلا پھسلا کر، ورغلا کر اور بہکا کر اپنے حلقے میں کھینچ کر لے آئے گی۔[۲۵] یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو پنڈت نہرو نے ہندوستان کی تمام صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو ذیل کا گشتی مراسلہ بھیجا۔ اس میں سے ایک اقتباس بطور حوالہ پیش کیا جاتا ہےجس سے ہندوؤں کی اردو دشمنی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

''اس سلسلہ میں ایک اور ضروری گزارش کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مرکزی دفتر میں اکثر شکایتیں موصول ہوتی ہیں کہ کانگریس کے جلسوں کے اشتہار عموماً اردو میں شائع نہیں کیے جاتے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کے جلسوں، جلوسوں کی اطلاع نہیں ہونے پاتی۔ یہ شکایت بالکل درست ہے۔ مہربانی فرما کر اپنے صوبے کی ضلع وار اور مقامی کانگریس کمیٹیوں کو سخت ہدایت کر دیجیے کہ آئندہ اردو میں بھی اشتہار شائع کریں۔ بالخصوص پنجاب، یوپی اور دہلی کے صوبوں اور ہندوستان کے دیگر بڑے بڑے شہروں میں اس قاعدے کی پابندی بے حد ضروری

ہے۔‘‘ [۲۶]

بانی پاکستان قائداعظم محمدعلی جناح اردو کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے بلند مرتبے پر دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پاکستان اور اردو زبان، دونوں کا مقدمہ بیک وقت لڑا۔ مصوّرِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اردو دوستی کا حق خوب ادا کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم نے ۱۹۳۶ء میں اردو کانفرنس منعقد کی اور باصرار علامہ محمد اقبال کو شرکت کی دعوت دی۔ علامہ بیمار تھے۔آپ نے جواب میں لکھا:

’’اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کے قابل ہوگیا تو ان شاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہوسکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگرچہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں۔‘‘

اسی طرح اپنے ایک اور خط میں علامہ اقبال نے بابائے اردو کو انجمن ترقیِ اردو کی بابت لکھا تھا:

’’آپ کی تحریک سے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ بہت سے اعتبارات سے یہ تحریک اس تحریک سے کسی طرح کم نہیں جس کی ابتداء سرسیّد احمد خان نے کی تھی۔‘‘ [۲۷]

ہندوؤں کی اردو سے مخالفت نے سرسیّد احمد خان اور دیگر اکابر سے مسلمانوں کے لئے کئی تعلیمی ادارے قائم کروائے۔ ۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک سکول کی بنیاد رکھی جسے ۱۸۷۷ء میں کالج کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سرسیّد کا یہ کارنامہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۸۶ء میں سرسیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس نے سرسیّد کے کام کو اور آگے بڑھایا۔ نواب عبداللطیف نے محمڈن لٹریری سوسائٹی کلکتہ میں قائم کی۔ اِسی طرح پنجاب میں

انجمن حمایتِ اسلام کا قیام عمل میں آیا۔ سندھ میں حسن علی آفندی نے سندھ مدرسۃ الاسلام قائم کیا۔ پشاور میں سرسیّد کی تعلیمی تحریک سے متاثر ہوکر اسلامیہ کالج پشاور قائم کیا گیا۔ ۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے ایک تقریر میں زور دے کرکہا کہ مسلمانوں کے تمدن کی حفاظت کا جذبہ تقاضا کرتا ہے کہ اُن کی کوئی سیاسی تنظیم ہو۔ ۱۹۰۶ء میں ان کا یہ خواب پورا ہوگیا۔ گویا اردو ہندی تنازع مسلم لیگ کی تشکیل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ [۲۸]

ہندوؤں نے اردو کو مسلمانوں کی ہزارسالہ حکومت کی نشانی سمجھا۔ وہ اسے صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔ یہ لسانی جھگڑا ہندو مسلم جھگڑے ہی کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت میں ہندی کو رانی اور اردو کو باندی بنادیا گیا جس سے ہندوؤں کا مطلب یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے اپنا گھر الگ کرلیا تو اپنی زبان کو بھی وہی سنبھالیں۔ ہندوؤں کی لسانی تنگ نظری کے بارے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ لکھتے ہیں :

> ''ایک زمانہ وہ تھا جب ہندو فارسی اور عربی کے عالم ہوا کرتے تھے لیکن اردو ہندی تنازع اور سیاسی حالات نے ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کردی اور وہ تعصب سے مغلوب ہوگئے۔ وہ اردو سے برگشتہ ہوکر ہندی کے حامی ہوتے گئے۔''[۲۹]

ہماری ڈیڑھ سوسالہ سیاسی اور ملّی تاریخ شاہد ہے کہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کی تمام قومی اور سیاسی جدوجہد کے دوران اردو اور صرف اردو کو ہی بین العلاقائی اور بین الصوبائی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس نے سب کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرویا۔ محبت اور یگانگت کا سبق سکھایا۔ سیّد احمد شہید بریلوی کی تحریکِ جہاد، تحریکِ دیوبند، تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ ندوۃ العلماء، تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اورتحریکِ اتحاد عالمِ اسلامی، ان سب اسلامی تحریکوں میں ذریعۂ اظہار

اردو ہی بنی رہی۔مسلمانوں نے پشاور وکشمیر سے لے کر راس کماری تک اور سندھ بلوچستان سے لے کر بنگال اور آسام تک اپنے قول وفعل سے اردو کی اس عمومی اور اجتماعی حیثیت کو جانا اور مانا ہے۔اس لئے سردار عبدالرب نشتر نے کہا تھا:

''واقعاتی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ حیثیت اردو ہی کو حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی قومی زبان بنے۔جن چیزوں نے ہم میں یہ احساس، یہ جذبہ اور یہ ذوق وشوق پیدا کیا تھا کہ اپنا علیحدہ وطن بنائیں ان میں سے ایک اہم چیز یہ تھی کہ ہم اردو کو اغیار کی دست برد سے محفوظ کر دیں۔''[۳۰]

مدیر''ادبی دنیا'' مولانا صلاح الدین احمد اردو زبان کے تاریخی کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مسلمانانِ ہند کا باہمی اتحاد جس قدرِ مشترک پر قائم ہے، وہ ہماری قومی زبان اردو ہے، جو نہ صرف ہمارے ارتباطِ باہم کا سب سے مؤثر اور زندہ ذریعہ ہے بلکہ ہندوستان میں ہمارے ہزار سالہ تمدّن کی امین اور ہماری مذہبی، ثقافتی اور علمی روایات کی سرمایہ دار ہے۔ اردو ہماری قومی زندگی اور ہماری ملّی تہذیب کا نشان بن کر نمودار ہوئی اور ہم نے اسلام کے بعد اردو کو اپنی عزیز ترین تمناؤں کا مرکز بنایا۔ پاکستان کا ایوانِ عظیم الشان ہم جن محکم ستونوں پر قائم کرنا چاہتے تھے، وہ تعداد میں چار تھے:اسلام، اتحاد، آزادی اور اردو۔اور جب ہمارے قائداعظم نے ہمیں اپنی منزلِ مقصود کی طرف پکارا تھا تو ایوانِ مملکت کے انھی چار ستونوں کی نشان دہی فرمائی تھی۔''[۳۱]

اُردو کا تحفظ برّصغیر میں مسلمانوں کی جنگِ آزادی کا ایک مستقل حصہ رہا ہے اور یہ تاریخی اہمیت اس زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔تحریک پاکستان میں اردو، پاکستان کی قومی زبان کے طور پر مطالبۂ تقسیم کے بعد دوسرا اور شاید سب سے بڑا ثقافتی مطالبہ،

نعرہ اور وعدہ رہی ہے۔ تحریکِ پاکستان کا محرکِ اوّل اگر اسلام تھا تو محرکِ دوم اردو زبان تھی اور قائداعظم کو بھی دیگر اکابر کی طرح اس حقیقت کا بخوبی علم تھا۔ اردو زبان کی عظمت یہ ہے کہ برّصغیر پاک و ہند میں اس نے تاریخ لکھنے کا نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ بنانے میں بھرپور کردار ادا کیااور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لئے بھی کہ اردو نے صرف ہماری تاریخ بنانے ہی کا نہیں بلکہ پاکستان کا جغرافیہ بھی بنانے میں اہم کردارادا کیا ہے۔ پاکستان کے حال اور مستقبل میں ثقافتی شیرازہ بندی، سیاسی استحکام، وحدت، ہم آہنگی، یک جہتی اور ریاستی تشخص کی ضامن اردو زبان ہی ہے۔

میرے نزدیک اردو زبان، اس کا رسم الخط اور املاء عقیدے کا مسئلہ ہے۔ برصغیر میں اردو کسی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو، یہ ہر مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان ضرور رہے اورعربی و فارسی کے بعد اسلامیانِ ہند کی واحد ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برّصغیر پاک و ہند کا مسلمان اس زبان کی حق تلفی پر جذباتی ہوجاتا ہے۔ اس کا جذباتی ہونا ایک فطری امر ہے۔ کیوں کہ اردو اس کے بزرگوں کی عزیز ترین کمائی ہے جسے سینچتے، پروان چڑھاتے اور دیس بہ دیس نشر و اشاعت کرتے انھیں صدیاں گزری ہیں اور وہ اپنے بزرگوں کی اس مقدس میراث کا جائز وارث ہے۔

●●●

حواشی وحوالہ جات

۱۔ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ ٥ سورہ الروم: ۲۲

(اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں جاننے والوں کے لئے)

۲۔ أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ٥ سورۃ الرّعد: ۲۸ (خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔)

۳۔ النووی، محی الدین ابوزکریا یحیٰی، الاربعون النُوَوِیَّۃ و شَرحُھا، ص ۵۹

۴۔ محمد حسین آزاد، مولانا، سخن دانِ فارس (لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۶ء) ص ۴۵

۵۔ قریشی، ڈاکٹر محمد اسحاق، برصغیر پاک و ہند میں عربی نعتیہ شاعری (لاہور: مرکز معارفِ اولیاء محکمہ اوقاف حکومت پنجاب، ۲۰۰۲ء) ص ۴۷۶

۶۔ خطباتِ رشید احمد صدیقی۔ مرتبین: مہر الٰہی ندیم (علیگ) / لطیف الزمان خان (کراچی: مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ، ۱۹۹۱ء) ص ۸۸

۷۔ بخاری، ڈاکٹر سہیل، لسانی مقالات، حصہ دوم (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء) ص ۴۱۷

۸۔ ....ایضاً............، ص ۴۱۸

۹۔ تاراچند، ڈاکٹر، ہندوستانی زبان کا مسئلہ، (۱۹۴۴ء)

۱۰۔ لسانی مقالات، حصہ دوم، ص ص ۴۱۵-۱۶

۱۱۔ ....ایضاً............، ص ۴۱۶

۱۲۔ ہندوستانی زبان کا مسئلہ، (۱۹۴۴ء)

۱۳۔ F.E Keay, A History of Hindi Literature, P-80

۱۴۔ محمد اکرام، شیخ، پاکستان کا ثقافتی ورثہ (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۱ء) ص ص ۱۲-۱۳

۱۵۔ زکریا، ڈاکٹر رفیق، ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ۱۹۸۵ء) ص ص ۳۹۶-۹۷

۱۶۔ ماہ نامہ اردو (جوبلی نمبر) کراچی: نومبر ۱۹۵۳ء ص ۹

۱۷۔ Separatism Among the Indian Muslims, P-44

۱۸۔ The Moslem Chronicle, May 30, 1903

۱۹۔ فاروقی، پروفیسر ڈاکٹر طاہر، ہماری زبان-مباحث و مسائل (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء) ص ۹۴

۲۰۔ محمد منوّر، پروفیسر، پاکستان-حصارِ اسلام (لاہور: گوہر سنز، لاہور، ۱۹۹۸ء) ص ۲۱

۲۱۔ ....ایضاً............، ص ۲۳

۲۲۔ پیام شاہ جہان پوری، تاریخ نظریۂ پاکستان (لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، ۱۹۷۰ء) ص ۳۱۹

۲۳۔ دیکھیے رسالہ اردو قومی زبان نمبر، ۱۹۳۸ء

۲۴۔ دیکھیے جمیل الدین احمد، Writings and Speeches of Muhammad Ali Jinnah جلد دوم (لاہور: ۱۹۷۴ء)

۲۵۔ بٹالوی، ڈاکٹر عاشق حسین، اقبال کے آخری دو سال (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء) ص ۳۷۶

۲۶۔ روز نامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۲/اپریل ۱۹۳۷ء

۲۷۔ ہماری زبان-مباحث ومسائل، ص ۴۰

۲۸۔ پاکستان-حصارِ اسلام، ص ۲۶

۲۹۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، ابوالکلام آزاد-اِمامِ عشق وجنوں (لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۰۹ء) ص ۵۰

۳۰۔ ہماری زبان - مباحث و مسائل، ص ۴۹

۳۱۔ صلاح الدین احمد، مولانا، مضمون ''اردو کے چند مسائل'' مشمولہ مقالاتِ شام ہمدرد، مرتبہ حکیم محمد سعید (لاہور: مکتبہ جدید ۱۹۶۹ء) ص ۲۰۱

اُردو کے خلاف 'قیامت کی چال'

زندہ قوموں کی روایت ہے کہ وہ اپنی زبان، اعلیٰ روایات، تہذیب و ثقافت سے محبت اور زبان و بیان پر فخر کرتی ہیں۔ ایک فرد روح اور بدن کے باہمی ربط سے زندہ رہتا ہے لیکن قوموں کی زندگی میں دیگر کئی عوامل کے علاوہ 'زبان' ایک توانا عامل ہوتی ہے۔ ہر متحرک قوم اپنے لسانی سرمائے کو زندہ رکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ اُردو زبان و ادب نے نہ صرف یہ کہ تحریک پاکستان میں حصہ لیا بلکہ اس وقت بھی قومی ہم آہنگی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اُردو کا تحفظ برصغیر میں مسلمانوں کی جنگِ آزادی کا ایک مستقل حصّہ رہا ہے۔ تحریکِ پاکستان کا محرکِ اوّل اگر اسلام تھا تو محرکِ دوم اُردو زبان تھی۔ اُردو زبان کی عظمت یہ ہے کہ برّصغیر پاک و ہند میں اس نے تاریخ لکھنے کا نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لیے بھی کہ اُردو نے صرف ہماری تاریخ بنانے ہی کا نہیں بلکہ پاکستان کا جغرافیہ بھی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پاکستان کے حال اور مستقبل میں ثقافتی شیرازہ بندی، سیاسی استحکام، وحدت، ہم آہنگی اور ریاستی تشخص کی ضامن اُردو زبان ہی ہے۔ قائداعظم اُردو کو قومی زبان کی حیثیت سے بلند مرتبے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اُردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلام کے بعد اُردو پاکستان کا سب سے بڑا ستون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے

پاکستان اور اُردو زبان، دونوں کا مقدمہ بیک وقت لڑا۔

یہ ایک طُرفہ ماجرا ہے کہ پاکستان میں موجود صوبائی عصبیتوں کو ختم کرنے کے لیے اُردو اپنا مادرانہ کردار ادا کر رہی ہے مگر اُسی اُردو کو نیست و نابود کرنے کے لیے یہ متحارب عصبیتیں آپس میں متحد ہو گئی ہیں۔ کچھ عناصر نے مکروہ عالمی سازش کا حصہ بنتے ہوئے اس دینی، تہذیبی اور ادبی ورثے (اردو) کے خلاف طبلِ جنگ بجا دیا ہے۔ بدقسمتی سے 'اشرافیہ' ان نام نہاد دانشوروں کے ساتھ مل گئی ہے۔ اب تو ایوانوں میں کھلے عام بے چاری اُردو کے خلاف مشورے ہونے لگے ہیں۔ حکومتی اشیر باد حاصل کر کے یہ دانشور گلا پھاڑ کر ہاؤ ہُو کر رہے ہیں۔ قدرت کا تماشا دیکھیے! وہ لالچ خورے جو ساری عمر اُردو کا کھاتے رہے، اُردو کے بل بُوتے پر عہدے اور مناصب حاصل کرتے رہے، کچھ در پردہ اور کچھ کھلے عام اُردو کے دشمنوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

اُردو کے خلاف اس اٹھائے جانے والے طوفان کے عوامل تو کئی ایک ہوں گے لیکن سب سے اہم اور فوری عامل اُردو کے حق میں پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کا ۸ر ستمبر ۲۰۱۵ء کا وہ تاریخ ساز فیصلہ ہے جس سے سازشی ذہنوں کو فکر دامن گیر ہوئی کہ اس فیصلے کے نفاذ سے کہیں ان کے مذموم مقاصد ادھورے نہ رہ جائیں۔ معاشرتی، معاشی اور نظری و فکری انتشار سے معمور موجودہ حالات میں ٹھہراؤ نہ آ جائے۔ ملکی سالمیت، قومی یک جہتی اور صوبائی ہم آہنگی کے فروغ میں کہیں اردو فیصلہ کُن کردار ادا نہ کر دے۔ عوامی شعور فروغ نہ پا جائے۔ جمہوری سوچ کہیں پروان نہ چڑھ جائے۔ مثبت رویّے تشکیل نہ پا جائیں۔ فزوں تر ہوتا لسانی انتشار اور بگاڑ اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچ جائے۔ یہ نام نہاد دانشور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے وطنِ عزیز کے کونوں کھدروں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں اور ''پاکستانی زبانوں کے فروغ'' کے نام پر اُردو کو ملیا میٹ کرنا چاہتے ہیں۔

پاکستان میں بولی جانے والی سبھی زبانیں بہت اہم، قابلِ احترام اور ہماری ثقافتی اقدار کی آئینہ دار ہیں۔ کوئی بھی محبِّ وطن ان میں سے کسی زبان کے بارے میں نفرت اور برے جذبات نہیں رکھ سکتا۔ زبانیں تو قرآن (سورۃ الروم:۲۲) کی رُو سے اللہ کی نشانیوں میں سے نشانی ہیں جو انسانی شخصیت میں ایک اہم مظہر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سب زبانوں کا فروغ، ترقی اور ان کی ترویج ہونی چاہیے۔ ان کی حق تلفی میرے نزدیک جرم ہے مگر ان کی ترقی کی آڑ میں اُردو سے اس کا مقام اور منصب (قومی زبان کا امتیاز) چھین لینا سب سے بڑا جرم ہے جس کا خمیازہ ہمیں اپنے دین سے دوری، ہزار سالہ تہذیب سے محرومی، عظیم ادبی سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھنے اور قومی تشخص کے خاتمے کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔ خدانخواستہ اُردو زبان اگر اپنے مرکز سے ہٹ گئی تو وطن عزیز پاکستان کی بقا خطرے سے دو چار ہو جائے گی۔ بدقسمتی سے کچھ نام نہاد دانشور گلوبل ازم سے متاثر ہو کر قومی زبان اور اس کے رسم الخط کو لپیٹنے پر تلے رہتے ہیں۔ نہیں معلوم اس طرح سوچنے والے کہاں سے یہ عقل کشید کرتے ہیں جس کے تحت اپنی تہذیب اور تمدّن کو چھوڑ کر 'نئی روشنی' اور 'دانش' کا راستہ نکالا جاتا ہے۔

راقم کا تعلق پنجاب سے ہے اور مادری زبان پنجابی ہے۔ اپنی اپنی زبانوں سے محبت کرنے والوں کی طرح مجھے بھی اپنی مادری زبان بہت عزیز ہے۔ میں بڑی جرأت سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں پنجابی بولتا اور سمجھتا تو ہوں مگر پنجابی میں ادب تخلیق کرنے کی مجھ میں صلاحیت نہیں کیوں کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے ہزاروں ادیبوں کی طرح میرا ذریعۂ اظہار، وسیلۂ ابلاغ اور تخلیقی میدان اردو ہے۔ میں اردو کو پنجابی سے کمتر درجے پر بھلا کیسے سمجھ سکتا ہوں؟ پنجابی زبان و ادب کے نامی ادیبوں، عالموں اور مصنفوں سے میرا تعلق ہے، شکرِ ربی کہ وہ پنجابی کے عالم ہو کر بھی اُردو سے محبت کرتے ہیں اور اس کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ بدقسمتی سے پنجابی زبان کے کچھ

(آٹے میں نمک کے برابر) ٹھیکیدار اُردو کو نیچا دکھانے کے درپے رہتے ہیں۔قومی مردم شماری کے دنوں میں گشتی فون کے ذریعے پنجابی کے حق میں خوب پیغام رسانی کی گئی۔ ایسا کرنا ہر کسی کا حق ہے جس سے انکار ممکن نہیں، مگر جب زور دے کر یہ کہا جائے کہ صرف پنجابی لکھو، پنجابی پڑھو اور پنجابی بولو تو اس کا مطلب سوائے اردو دشمنی کے کچھ اور نہیں۔ یہ عناصر ہمہ وقت اور ہر جا اُردو کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے میں 'مبتلا' رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک 'دانشور' سے میرا سامنا ہوا تو موصوف نے اپنی گفتگو میں اُردو کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اسی پر بس نہیں کی بلکہ محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کو بھی کوسنے لگے کہ انھوں نے یہاں آ کر ہمارے راجوں مہاراجوں پر بہت مظالم ڈھائے۔ موصوف کا یہ کہنا تھا کہ اُردو تو صرف یو پی کے کچھ ہزار مسلمانوں کی زبان تھی، سیاسی مقاصد کے لیے اسے ترقی دی گئی اور مقامی زبانوں کی حق تلفی ہوئی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یو پی کا نام ایسے ہی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ دراصل ۱۸۶۷ء میں یو پی کے ہندوؤں نے اردو کے خلاف تحریک چلائی اور مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے اور دیو ناگری رسم الخط کو سرکاری حیثیت دی جائے۔ یہ ''گروہِ دانشوراں'' دراصل ہندوؤں کے اُسی ایجنڈے کی تکمیل چاہتا ہے۔لطف کی بات یہ تھی کہ موصوف پنجابی زبان کا مقدمہ ایک دوسرے پنجابی (راقم) کے سامنے بڑی شُستہ اردو میں پیش کررہے تھے۔

اُردو کی مخالفت میں کمر بستہ حضرات اصل میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں، خلطِ مبحث کے ذریعے نئی نسل کو اردو کے بارے میں گمراہ کرنے کی چالیں چل رہے ہیں، حالاں کہ وہ حقائق کا ادراک رکھتے ہیں۔ انھیں بخوبی علم ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ مقبولِ عام زبان اُردو کی تشکیل ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اُردو کو پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے کیوں بلند مرتبے پر فائز دیکھنا

چاہتے تھے؟ قائد کی بصیرت سے متعلق انھیں شرحِ صدر ہے اور وہ جانتے ہیں کہ قائد کو اُردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا......مگر کیا کیا جائے کہ کتمانِ حق کا رویہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ ہر ملک کی قومی زبان اس کے قومی تشخص کی آئینہ دار ہوتی ہے۔قومی زبان اور قومی تشخص میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ لوگ کیا جانیں قومی تشخص کیا ہوتا ہے؟ یہ تو پاکستان میں ستّر (۷۰) سے زیادہ بولی جانے والی پاکستانی زبانوں کو ''قومی زبان'' کا تاج پہنا کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ستّر (۷۰) سے زیادہ قومیں آباد ہیں اور پاکستان کے ستّر (۷۰) سے زیادہ قومی تشخص ہیں۔

اُردو سے اس کا مقام اور امتیاز چھین کر (خدانخواستہ) ان لوگوں کا اگلا ہدف اُردو کے رسم الخط کو ختم کرنا ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے بیرونی طاقتوں سے انھیں تحریص اور ترغیب مل رہی ہے۔ زبان اور رسم الخط کا تعلق بھی روح اور قالب سے کم نہیں۔ زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع و امتزاج زبان کو زندہ و پائندہ بناتا ہے اس لیے کسی زبان کو اس کے رسم الخط سے جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ خدانخواستہ اُردو کو رومن جامہ پہنا دیا گیا تو یہ ختم ہو جائے گی۔ اُردو کا رسم الخط چوں کہ قرآنی رسم الخط ہے، اس وجہ سے بھی لوگ حروف و الفاظ سے بہت مانوس ہیں۔ رومن رسم الخط جڑ پکڑ گیا تو لوگ فہم قرآن سے بھی دور ہو جائیں گے۔

یہ ''گروہِ دانشوراں'' نئی نسل کو گمراہ کرنے کے لیے اُردو کو یوپی تک محدود بتاتا ہے حالاں کہ حقیقت ان پر عیاں ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تمام قومی اور سیاسی جدوجہد کے دوران اردو اور صرف اردو ہی کو بین العلاقائی اور بین الصوبائی زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ اس نے سب کو اتحاد و اتفاق کی لڑی میں پرو دیا۔ تحریکِ مجاہدین، تحریکِ دیو بند، تحریکِ علی گڑھ، تحریکِ ندوۃ العلماء، تحریکِ خلافت، تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان، ان سب تحریکوں میں ذریعۂ اظہار و ابلاغ اُردو ہی بنی رہی اور اس کی عمومی اور اجتماعی حیثیت کو جانا اور مانا گیا۔

میرے نزدیک اُردو زبان، اس کا رسم الخط اور املا عقیدے کا مسئلہ ہے۔ پاکستان بلکہ پورے برصغیر میں اُردو کسی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو، یہ ہر مسلمان کی مذہبی اور ثقافتی زبان ضرور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کا مسلمان اس زبان کی حق تلفی پر تڑپ اٹھتا ہے۔ اُردو سے محبت کرنے والوں کے لیے میرا پیغام ہے کہ اپنے اس عظیم دینی، ادبی اور تہذیبی ورثے کو بچانے کے لیے دیوانہ وار اُٹھیں اور اُردو دشمن رویوں کو ناکام و نامراد بنا دیں:

اُٹھو وگرنہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح
اک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا

(جسٹس شاہ دین ہمایوں)

●●●

اُردو تو بے زبان ہے کس سے کرے سوال

(بھارت میں اُردو کی زبوں حالی پر عظیم اختر کا شہر آشوب)

ہندوستان میں ''گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار'' اُردو کی زبوں حالی پر، میں ایسے موقع پر خامہ فرسائی کر رہا ہوں کہ خود پاکستان میں ''قومی زبان'' کا وجود خطرے میں ہے اور اس کے دشمن بزعم خویش اس کی تجہیز و تکفین کی تیاریوں میں سرگرم ہیں۔ اُردو کے حق میں پاکستان کی عدالتِ عظمٰی کے ۸؍ستمبر۲۰۱۵ء کے تاریخ ساز فیصلے کے بعد، بدقسمتی سے نام نہاد دانشوروں اور 'اشرافیہ' نے باہم مل کر اردو کے خلاف طبلِ جنگ بجا دیا ہے۔ اب تو ایوانوں میں کھلے عام بے چاری اُردو کے خلاف مشورے ہونے لگے ہیں حال آں کہ بانئ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۲۱؍مارچ ۱۹۴۸ء کو اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے واضح طور پر فرمایا تھا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی، کوئی دوسری نہیں۔ آئینِ پاکستان بھی اسے 'قومی زبان' کا درجہ دیتا ہے مگر اس بے چاری کے حالات پاکستان میں کبھی اچھے نہیں رہے۔ میرا موضوع چوں کہ بھارت میں اُردو کی صورتِ حال کا تجزیہ ہے لہٰذا اصل موضوع کی طرف پلٹ آتا ہوں۔

ہندوستان میں سیاسی جلسوں، انتخابی مہموں، مشاعروں، ریاستی اُردو اکیڈمیوں اور دیگر نیم سرکاری اداروں کے سیمیناروں اور جلسوں میں، اُردو زبان کے بارے میں

اس قسم کے سیاسی بیانات آئے دن فضا میں گونجتے رہتے ہیں:

- اُردو کسی مخصوص فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔
- اُردو ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کی مشترکہ زبان ہے۔
- اُردو گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔
- اُردو ہندوستانی متحدہ قومیت کی ایک درخشاں علامت ہے۔
- اُردو ہندوسانی زبانوں کا تاج محل ہے۔
- ہندوستان کی کوئی زبان اُردو کی برابری نہیں کرسکتی۔
- آج کا سچ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر طرف اُردو کا بول بالا ہے۔
- ہندوستان میں اُردو کا مستقبل روشن ہے۔

اُردو زبان و ادب کا ہر چھوٹا بڑا 'دانشور' اور 'مفکر' سیاست دانوں کے سُروں میں یہ راگ الاپتا ہوا نظر آتا ہے۔ زمینی حقائق کے آئینے اور تاریخی سچائیوں کے تناظر میں اُردو کے مسئلے کا جائزہ لینے کی بجائے سیاست دانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُن کے سُر میں سُر ملانا کسی بڑی خودفریبی سے کم نہیں ہے۔

علی گڑھ، لکھنؤ، دہلی اور حیدرآباد (دکن) جہاں کی عام سماجی زندگی میں ہمہ وقت اُردو زبان کی خوشبو تیرتی رہتی تھی اب وہاں کی گلیوں، کوچوں اور فضاؤں میں اُردو کی زبوں حالی اور کس مپرسی کو دیکھ کر جناب عظیم اختر کو دکھ پہنچتا ہے۔ اس بات کا شدّت سے احساس ہوا ہے کہ مفاد پرست اُردو دان 'طبقۂ اشرافیہ' نے "گنگا جمنی تہذیب" کی علم بردار زبان کو سیکولر اور جمہوری ملک کی عام سماجی اور لسانی زندگی میں حاشیے پر پہنچا دیا ہے۔ اُردو کے ان جاگیرداروں کو اس کے فروغ اور تحفظ سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ یہ طبقہ، اُردو کا طبقۂ اشرافیہ کہلاتا ہے جو اپنے ادبی قد و قامت اور ذاتی تشہیر کے لئے اُردو کو ہر پہلو سے نچوڑ رہا ہے۔ بدقسمتی سے اُردو معاشرہ بڑی بے حسی سے اس استحصال کو دیکھ رہا ہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کے خلاف اُردو دنیا میں

عظیم اختر نے بھرپور صدائے احتجاج بلند کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو مضامین تحریر کیے اُن میں چوٹ، تعریض اور طنز اس قدر توانا ہیں کہ تحریر کوکئی گنا اثر آفریں بنا دیتے ہیں۔ اُردو کے ساتھ کی جانے والی اپنوں اور غیروں کی مسلسل ناانصافیوں کے خلاف شیدائے اُردو جناب عظیم اختر کوئی پندرہ سال سے اس رویّے کے خلاف اور اُردو کے حق میں مضامین لکھ کر صدائے احتجاج بلند کرر ہے ہیں۔ یہ مضامین ہندوستان کے نامور علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اُردو زبان کے سچے وکیل اور ترجمان جناب عظیم اختر دہلی کی زبان، اس کی تہذیب، تاریخ اور ادب کا چلتا پھرتا دائرۃ المعارف ہیں۔ ان میں دہلی والوں کی روایتی تمکنت، کج کلاہی، وضع داری، صاف گوئی، بے باکی، بانکپن اور زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُردو اور دہلی ان کی دو کمزوریاں ہیں، ان کی خاطر وہ کسی حد تک جاسکتے ہیں، کچھ بھی برداشت کر سکتے ہیں۔ عظیم اختر کی شخصیت میں شائستگی ہے اور نفاست بھی۔ ان کی تحریر موقع پرستوں اور استحصال پسندوں کو کچوکے لگاتی ہے۔ ان کے موضوعات میں ایک ایسا تنوع ہے جو ان کے پڑھنے والے کو ہمہ رنگ کا ذائقہ دیتا ہے۔ ان کا اسلوب 'ایجادِ بندہ، ہے اور یہ بڑی بات ہے۔ میں نے خاکوں پر مشتمل عظیم اختر کی دو کتابیں ''دِلّی- میری بستی میرے لوگ'' اور ''دلّی والے- دیدہ وشنیدہ'' پڑھی ہیں۔ انھوں نے اپنی خاکہ نگاری سے دہلوی ثقافت کی کوکھ کے زائیدہ کرداروں کو حیاتِ جاوداں بخش دی ہے۔ انھوں نے بے حد شگفتہ اور شُستہ نثر میں خاکہ نگاری کی ہے۔ وہ دہلوی کرداروں کو اپنے اسلوب کی ساحری سے یوں مجسم کر دیتے ہیں کہ وہ کردار بھلائے نہیں بھولتا۔ ان کی کامیاب خاکہ نگاری ہر دل چسپ دہلوی کردار کو للچاتی ہے کہ اسے بھی خاکہ نگار اپنا موضوع بنا لے۔

دہلی عظیم اختر کی جائے پیدائش نہیں ہے، وہ اتر پردیش کے شہر مظفر نگر میں پیدا ہوئے لیکن دہلی اُن کے رگ و پے میں بسی ہوئی ہے۔ عظیم اختر نے ایک علمی و

ادبی خانوادے میں آنکھیں کھولیں۔ اُن کے دادا قاضی محمد عمر درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ تھے۔ لوگ ان کے علم و فضل کی بنا پر انھیں 'منشی' کہتے تھے۔ قاضی صاحب اپنے زمانے کے مثالی معلم، معتبر شاعر اور دیندار انسان تھے۔ کاندھلہ میں تقرر کے دوران، شاعر مزدور احسان دانش نے اُن سے تعلیم حاصل کی اور کتنے ہی دیگر نونہالوں کی طرح اُن کے زیرِ سایہ پنپے۔ ان کے والد مولانا علیم اختر مظفر نگری علاّمہ سیماب اکبر آبادی کے شاگرد اور پختہ گو شاعر تھے۔ شاعری علیم اختر کو وراثت میں ملی۔ دورِ طالبِ علمی میں ایک طرحی مشاعرے میں شرکت کی، مصرع طرح تھا:

ع   فلک ہی بے ستوں ٹھہرا تو میں کرلوں فغاں کیوں کر

اس پر انھوں نے غزل کہی جس کا مطلع تھا:

ہے جب حکمِ زباں بندی تو میں کھولوں زباں کیوں کر
سنا دوں اپنے اُجڑے آشیاں کی داستاں کیوں کر

علیم اختر مظفر نگری بیسویں صدی کے اُن گنے چُنے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے تغزل اور فنِ جمالیات کا حق ادا کیا ہے۔ جہاں تک ان کی غزل گوئی، شاعری کے موضوعات اور اسالیب فکر کا تعلق ہے، اس میں وہ محبوب کے زلف و کاکل اور گل و بلبل تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اُن کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔ تقریباً ربع صدی تک ماہ نامہ ''شمع'' میں بحیثیت مدیر کام کیا اور اسے فرش سے عرش پر پہنچا کر ماہِ کامل کی طرح درخشاں بنا دیا۔

جناب عظیم اختر اپنے والد بزرگوار مولانا علیم اختر مظفر نگری کے ساتھ دہلی آئے تو ان کی عمر صرف چھے سال تھی۔ ان کی شخصیت کا خمیر دہلی میں تیار ہوا اور ایسے ماحول میں نشو ونما ہوئی جہاں اٹھتے بیٹھتے شعر و سخن کے چرچے تھے۔ دہلی میں تعلیم و تربیت پائی۔ دہلی کالج سے بی اے کیا۔ ۱۹۶۵ء میں بطور اسسٹنٹ جرنلسٹ سرکاری

ملازمت اختیار کی اور حکومتِ دہلی میں اے ڈی ایم کے عہدے سے ۲۰۰۲ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کے مضامین اخبارات اور رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جناب عظیم اختر کی اب تک متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں: ا۔ حرفِ نیم کش، ۲۔ دِلی......حرف حرف چہرے، ۳۔ دلی...... میری بستی میرے لوگ، ۴۔ بیسویں صدی کے شعرائے دلی (دو جلدیں)، ۵۔ دلی والے: دیدۂ و شنیدہ۔ جناب عظیم اختر کو اپنی رائے کے اظہار سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ اپنے کالم 'حرفِ نیم کش' سے انھوں نے 'ضربِ کلیم' کا کام لیا ہے۔ وہ اپنی طرز کے ایک انتہائی وضع دار انسان ہیں جو ہوا کے ساتھ رخ نہیں بدلتے بلکہ ضروری سمجھیں تو طوفانوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اُردو کے فروغ اور ترقی کے مسائل بہت پیچیدہ ہو کر نازک مرحلوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اہلِ اقتدار اور اہلِ زبان کی بے خبری اور اُردو کے مسائل کو الجھانے کی کوششیں جناب عظیم اختر کے تعمیری اور حل طلب مزاج کو پریشان کرتی رہتی ہیں اور یہی پریشانی ان کی انگلیوں میں قلم تھما دیتی ہے۔ جناب عظیم اختر مسلسل کئی سالوں سے ہندوستان میں اُردو کا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ وہ اُردو کے دفاع میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے علمی و ادبی جریدے ''گلبن'' اور دیگر کئی رسائل میں متواتر لکھ رہے ہیں۔ میں نے ''گلبن'' میں شائع ہونے والے ان تمام مضامین کو پڑھا ہے۔ یہ مضامین عظیم اختر کے دل کی آواز ہیں اور ہندوستان میں اُردو کی موجودہ صورتِ حال کے تناظر میں دردناک مرثیہ اور شہرِ آشوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ ہندوستان میں اُردو کی صورتِ حال سے بے خبر ہیں اُن کے لئے یہ مضامین کسی بھی بڑے انکشاف سے کم نہیں۔

ہندوستان میں اُردو کا منظر نامہ

جناب عظیم اختر کہتے ہیں کہ اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ اردو اپنے مخصوص اسلامی اساس کی وجہ سے مسلم تہذیب و تمدن اور معاشرت کی پہچان رکھتی ہے

جس کی وجہ سے تاریخ کے کسی بھی دور میں اُردو اس ملک کی اکثریت کے گھروں میں گھر نہیں کر سکی۔ سِکّہ رائج الوقت ہونے کی وجہ سے اُردو کی تعلیم کاروباری ضرورتوں اور روزی کمانے کی مجبوریوں کی وجہ سے مردوں کی ضرورت تھی۔ اکثریتی طبقے کے صرف مرد ہی اُردو کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ اُردو، مسلم گھروں میں بھی اپنے لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں کے لئے ترسنے لگی ہے اور عالم یہ ہے کہ دہلی کے اوکھلا، ذاکر نگر جیسے خالص مسلم علاقوں میں اُردو کے اخبارات سب سے کم بکتے ہیں۔ مساجد میں نمازیوں کو ہندی زبان میں تحریری اطلاع دینے کا رواج عام ہے۔ اُردو مشاعروں اور خالص اسلامی جلسوں کے پوسٹر عام طور پر دیوناگری رسم الخط ہی میں دیواروں پر نظر آتے ہیں۔ نائیوں کی دکانوں اور چائے خانوں میں صرف ہندی کے اخبارات ہی میزوں پر رکھے نظر آتے ہیں۔ اتر پردیش میں مسلمانوں کے خالص اکثریتی علاقوں میں اردو کا گزر بہت مشکل ہو گیا ہے۔ مسلم محلوں اور علاقوں میں اُردو کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر نظر آتا ہے۔ سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات تو اُردو سے نابلد ہی ہیں چالیس پچاس سال کی عمر والے بھی اکثر کلمہ گو حضرات اُردو بس برائے نام جانتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ٹنڈن اور سمپورنانند جیسے تنگ نظر اور متعصب ہندو لیڈروں کی پیش گوئی کے عین مطابق ہے۔

جناب عظیم اختر کا گہرا مشاہدہ ہے کہ آج اگر اُردو کسی نہ کسی طور زندہ ہے تو اُردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے ان کلمہ گوؤں کی بدولت زندہ ہے جنھوں نے اس زبان کو اپنے اجداد کی وراثت اور قرآن و حدیث کی تفسیر سمجھ کر گلے لگا لیا، جن کے بچے آج بھی دینی مدرسوں اور معمولی سکولوں میں ٹاٹ کی پٹیوں پر بیٹھ کر اس ملک میں اُردو کو ایک زبان کی حیثیت سے زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ آج ہمارے شہروں اور قصبوں کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں نظر آنے والا اُردو کا تھوڑا بہت چلن پسماندگی کے گڑھے میں گرے ہوئے ان عام اُردو بولنے والوں کے دم ہی سے باقی

ہے۔عظیم اختر یقین سے کہتے ہیں کہ اُردو، تاریخ کے کسی بھی دور میں ہندوؤں، مسلمانوں،سکھوں اور عیسائیوں کی مشترک زبان کبھی نہیں رہی۔ اس کے رسم الخط کا تعلق غیر مسلم گھرانوں سے کبھی نہیں رہا۔تقسیمِ وطن سے پہلے اور تقسیم وطن کے بعد بھی مسلمانوں نے اُردو کو قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان، اپنے اجداد کا ورثہ، اپنے اسلاف کی قدروں کی علمبردار اور اپنے دینی تشخص کی علامت سمجھ کر گلے سے لگایا اور اُردو کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ ہندوؤں نے اُردو کی محبت میں نہیں بلکہ سماجی، معاشی اور کاروباری تقاضوں کو پورا کرنے اور نوکریاں حاصل کرنے کے لئے اُردو کی تعلیم حاصل کی، لیکن اُردو کو اپنے گھروں میں داخل نہیں ہونے دیا۔خواتین کی تعلیم صرف ہندی زبان تک ہی محدود رکھی جاتی تھی۔ ہندو اپنی ہندی زبان اور ہندی کلچر کو اُردو اور اس کی مخصوص تہذیب سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

عظیم اختر کا کہنا ہے کہ تقسیمِ وطن سے قبل اُردو کو ہندی پر برتری حاصل تھی لیکن تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان کے لسانی منظر نامے نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا۔ اُردو کا کاروباری تقاضوں سے رشتہ منقطع ہو گیا۔ اُردو کی اعلیٰ ڈگریوں کی افادیت ختم ہو گئی۔ یہ ڈگریاں اب اچھی نوکریاں اور روزگار فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔اُردو کی تعلیم اب کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن ان سب باتوں کے باوجود اُردو کو متحدہ قومیت کی ایک روشن علامت اور ہندوستانی عوام کی ایک مشترک زبان قرار دینے والے نام نہاد مفکروں، مدبّروں اور دانشوروں کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اس حقیقت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کے لئے تیار نہیں کہ عملی طور پر اُردو کی تعلیم صرف غریب مسلمان ہی حاصل کر رہے ہیں۔سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس ''مشترک زبان'' کی تعلیم صرف مسلمان لڑکے لڑکیاں ہی حاصل کرتے ہیں۔اُردو میڈیم سکول صرف مسلم علاقوں میں نظر آتے ہیں۔ غیر مسلم اپنے بچوں کو اُردو میڈیم سکولوں میں داخل ہی نہیں کراتے۔حقیقت یہ ہے کہ آج غیر مسلم طبقے کا اُردو سے تکلّفاً بھی کوئی

تعلق نہیں ہے۔ اُردو اخبارات و رسائل اور کتابیں صرف مسلم علاقوں ہی میں بکتی ہیں۔ دورانِ سفر ریل یا بس میں صرف مسلم مسافر ہی اُردو کا اخبار یا رسالہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ بچوں اور خواتین کے لئے چھپنے والے اُردو رسالے صرف مسلم گھروں ہی میں پڑھے جاتے ہیں۔ اُردو میں لکھے ہوئے بورڈ صرف مسلم علاقوں ہی میں دکانوں اور دفتروں پر نظر آتے ہیں۔

عظیم اختر کے مطابق سچ تو یہ ہے کہ اُردو کے زندہ رہنے کا سہرا شمالی ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے چھوٹے بڑے دینی مدارس کے سر جاتا ہے۔ دہلی، یوپی اور بہار کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں رہنے والے متوسط طبقے کے مسلمانوں کے سر بندھتا ہے جن کے بچے اُردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ترقی پسند طبقے نے تو اپنے بچوں کے اعلیٰ اور بہتر مستقبل کے لئے اپنے گھروں کے دروازے خود اُردو پر بند کر دیے ہیں۔ اُردو دنیا کے وہ لوگ جن کی معیشت کا تعلق اُردو سے ہے، جن کی شہرت کا محل اُردو کی بنیاد پر کھڑا ہے، اُردو کے تعلق سے جن کی خدماتِ جلیلہ کو سراہا جاتا ہے اور انھیں سرکاری انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے انھوں نے اپنے بچوں کو اُردو کی تعلیم سے دور ہی رکھا ہے۔ دہلی اُردو ادب کا گھر اور گہوارہ ہے۔ یہاں اُردو میڈیم سکول ہیں۔ دہلی کی تین یونیورسٹیوں کے علاوہ بہت سے کالجوں میں اُردو کے شعبے موجود ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اُردو کی بنیادوں پر اپنی شہرت اور معیشت کا محل کھڑا کرنے والے پروفیسروں، نقادوں، محققوں، دانشوروں، مدبّروں، مفکروں اور اردو کے کثیر الاشاعت اخبارات و رسائل کے مالکوں اور مدیروں نے اُردو کی محبت میں آج تک اپنے کسی بچے کو اُردو میڈیم سکول میں داخل نہیں کرایا۔ بدقسمتی سے ان کے بچے بھی غیر مسلم بچوں کی طرح اُردو کے حروفِ تہجّی کی شناخت نہیں کر سکتے۔ یہ، اُردو تعلیم کو فروغ دینے والے نقادوں، مدیروں اور ہمہ وقت اُردو کے تحفظ اور بقا کا رونا رونے والوں کی منافقت اور ابن الوقتی

کی بدترین مثال ہے۔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آج ہندوستان میں اُردو انھی کی کوششوں سے زندہ ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اُردو، اِن نام نہاد مجاہدینِ اُردو کی کوششوں کی وجہ سے نہیں بلکہ دہلی، یوپی اور بہار جیسی ریاستوں کے دیہاتوں، قصبوں اور شہروں میں رہنے والے معاشی طور پر پست اور متوسط طبقے کے گمنام مسلمانوں کی بدولت زندہ ہے جنھوں نے اُردو کو گنگا جمنی تہذیب کی علامت کے طور پر نہیں بلکہ اپنے دینی، مذہبی اور ملّی تشخص کی علامت کے طور پر گلے سے لگایا ہے۔

اُردو کے موجودہ منظر نامے کی اس حقیقت سے چشم پوشی تو کی جاسکتی ہے لیکن جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ اُردو اخبارات و رسائل کی طرح آج کا مشاعرہ بھی کلمہ گو اور باریش سامعین تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ شادی بیاہ کے دعوت ناموں نے اب دیوناگری رسم الخط اپنا لیا ہے۔ قبروں پر کتبے ہندی میں لکھے جانے لگے ہیں۔ یہی نہیں اب ہندی مساجد میں بھی در آئی ہے۔ مساجد کے بورڈوں پر اوقاتِ نماز اور اس قسم کی دوسری اطلاعات کو دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ اُردو اخبارات کی فروخت افسوس ناک حدتک کم ہو گئی ہے۔ سائن بورڈ اردو کی بجائے ہندی اور انگریزی میں نظر آتے ہیں۔ اُردو مشاعروں کے بینر ہندی میں ہوتے ہیں۔ اس سے بھی افسوس ناک بات یہ ہے کہ شاعر اپنا کلام دیو ناگری میں لکھتے ہیں اور مشاعرے میں اُردو میں پڑھتے ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی زبان کے اس زوال کو شعوری اور غیر شعوری طور پر قبول کر لیا ہے اور اپنی مادری زبان چھوڑ کر سیکولر بھارت کے مین سٹریم میں بہہ رہے ہیں۔ اُردو کے تحفظ اور بقا سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہے...... اُردو سے اگر دل چسپی ہے تو مشاعرہ باز شاعروں، رنگ برنگے چھپنے والے اخباروں میں کام کرنے والے صحافیوں اور اُردو دنیا میں ولایت کے مرتبے تک پہنچنے والے نقادوں کو ہے جن کو اردو کا زوال بھرپور انداز سے راس آیا ہے۔

یہ نیا منظر نامہ اور اس کی زمینی حقیقت اس بات کی متقاضی ہے کہ نوشتۂ

دیوار پڑھ لیا جائے اور اُردو زبان کے تعلق سے پرچھائیوں کے پیچھے دوڑ کر اُردو والے مزید خودفریبی میں مبتلا نہ رہیں۔

اُردو کا استحصال کرنے والے عناصر

جناب عظیم اختر، متعصب ہندو سیاست دانوں کے علاوہ مندرجہ ذیل عناصر کو اُردو کی زبوں حالی کا ذمہ دار گردانتے ہیں:

ا۔ اُردو نقّاد، ورکنگ اور ریٹائرڈ پروفیسر حضرات

یہ حقیقت کسی المیے سے کم نہیں کہ اسلامی اساس رکھنے کی پاداش میں اُردو کا شجرِ سایہ دار ایک ویران درخت میں تبدیل ہو چکا ہے اور اس کا نام نہاد سایہ صرف مسلم محلوں اور بستیوں میں نظر آتا ہے۔ اُردو کے نام نہادنقاداور پروفیسر حضرات اس لُنڈ مُنڈ درخت کی آبیاری کرنے اور اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانے کی بجائے اس کا بھرپور استحصال کررہے ہیں۔ اُردو کو، دودھ دینے والی گائے کے ہر تھن سے آخری بوند تک نچوڑنے والے ماہر گوالے کی طرح دوہ رہے ہیں اور اپنی اپنی بالٹیاں بھر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو طلبہ میں جودتِ فکر کی جلا کرنے، تحقیقی بصیرت پیدا کرنے اور تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی بجائے درس و تدریس کے میدان میں کسا د بازاری کا ماحول گرم کررہے ہیں۔ جامعات میں اُردو تعلیم و تحقیق کا معیار اپنے بال نوچتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اُردو کے زوال کے ساتھ اس زبان کے پروفیسر نقادوں اور محققوں کو ہی عروج حاصل ہوا ہے اور سیاسی وفاداریوں کے صلے میں اُردو کے نیم سرکاری اداروں اور ریاستی اُردو اکیڈمیوں میں اعلیٰ عہدے حاصل کیے ہیں۔ ان اعلیٰ عہدوں پر چھاپہ ماری نے ان کے دن ہی پھیر دیے ہیں۔ سرکاری خرچے پر اپنی نمود و نمائش اور سیلف پروجیکشن کررہے ہیں۔ جناب عظیم اختر کے مطابق ان اداروں کی سربراہی حاصل کرنے والے پروفیسر نقاد، اُردو کے نادر مخطوطوں اور نایاب کتب کی اشاعت کی بجائے اپنی مرتب کردہ کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دے کر صرف اپنی

مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں اضافہ کررہے ہیں۔ ان اداروں کے ذریعے اپنی ایسی کتابیں شائع کرہے ہیں جن کو اُردو کا عام پبلشر ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اُردو کو عوامی سطح پر فروغ دیے جانے کے مقصد سے قائم کیے جانے والے ان اداروں کو اُردو دنیا کے ان بڑوں نے صرف اپنے ادبی تشخص کو فروغ دینے کے لئے استعمال کیا ہے۔

جناب عظیم اختر انکشاف کرتے ہیں کہ تخلیقی صلاحیتوں سے کورے، ادب کے یہ پاسبان، سیمیناروں میں پیش کیے گئے دوسرے اہلِ قلم حضرات کے مقالوں کو مرتب کرکے اُردو کے سرکاری اداروں سے شائع کراتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تیس چالیس سالہ ملازمت کے دوران ایک بھی مضمون نہیں لکھا۔ ادب کے یہ پاسبان یونیورسٹیوں میں ہر سال پی ایچ ڈی کراتے ہیں اور ایسے ایسے ریسرچ سکالرز کے گلے میں ڈاکٹریٹ کا ہار ڈالتے ہیں جن کا صحیح معنوں میں شین قاف بھی درست نہیں ہوتا، جس کے نتیجے میں ایسے تحقیقی مقالے آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں جن پر تحقیق نوحہ خواں نظر آتی ہے۔ عظیم اختر صاحب سرکاری عہدے حاصل کرنے والے نقادوں اور ادیبوں کو ''گوئبلز'' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہٹلر کے دور میں تو ایک ہی گوئبلز پیدا ہوا تھا لیکن ہمارے ملک میں اُردو کے فروغ وتحفظ کے نام سے قائم کیے گئے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور ان سے حاصل ہونے والے فیوض و برکات نے ''عالمی شہرت یافتہ'' پروفیسر نقادوں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی شکل میں لاتعداد گوئبلز پیدا کر دیے ہیں۔

۲۔مشاعروں کا کردار

جناب وسیم بریلوی وائس چیئرمین، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، حکومتِ ہند کے اس بیان اور موقف پر عظیم اختر احتجاج کرتے ہیں اور حقائق کی روشنی میں اسے مسترد کرتے ہیں:

'' اُردو کو تقسیمِ وطن کے بعد ہندوستان میں زندہ ہی مشاعروں نے

رکھا ہے۔ پہلے اس میں زیادہ تر مسلمان حصہ لیتے تھے مگر آج شعراء
اور سامعین دونوں میں دیگر مذاہب کے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی
ہے۔ اُردو زبان اور مشاعروں کا سیکولر مزاج ایک بار پھر مختلف
مذاہب ومسالک کے لوگوں کو جوڑنے لگا ہے۔"

عظیم اختر کا موقف یہ ہے کہ اُردو تہذیب کی ڈیڑھ دو سو سالہ روایت صحیح معنوں میں شاعر کی تخلیقی صلاحیتوں اور سامعین کی شعرفہمی کی ایک کسوٹی رہی ہے، جہاں شعر سنانے اور سننے والے سخن سنجی اور سخن فہمی کے تناظر میں ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں، آنکتے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُردو کے ہر بڑے اور معتبر شاعر نے مشاعروں کے سٹیج ہی سے اپنا شعری سفر شروع کیا اور ادب میں اپنی شناخت قائم کی۔ لیکن یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب مشاعرہ ادبی تہذیب کا ایک انسٹی ٹیوشن سمجھا جاتا تھا۔ باذوق اور باحیثیت افراد مشاعروں کا انتظام و انصرام کیا کرتے تھے۔ گزشتہ چالیس پچاس برسوں میں، جب سے اُردو دنیا میں شعرفہمی سے نابلد چندے باز اور پیشہ ور منتظمینِ مشاعرہ کی کلاس نے جنم لیا ہے مشاعرہ کی روایتیں اور قدریں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہیں۔ مشاعروں میں شاعرات کے روپ میں دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی غزلیں گا کر اور لہک لہک کر پڑھنے والی خواتین کی شرکت نے مشاعروں کو نہ صرف ایک تفریحی پروگرام بنا دیا ہے بلکہ اس کی ثقہ روایتوں اور قدروں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اُردو تہذیب اور اس کی قدروں کے موجودہ امین ومحافظ اپنی زبان کے ساتھ یہ بھیانک مذاق کب تک کرتے رہیں گے؟

عظیم اختر کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب اُردو تہذیب کی پرچھائیوں میں پلے بڑھے غیر مسلم سامعین کی اکثریت مشاعروں میں نظر آیا کرتی تھی۔ مشاعروں کو مشاعرہ ہی سمجھا جاتا تھا نہ کہ تفریحِ طبع کا ذریعہ۔ آج جب کہ عام سماجی اور عوامی

زندگی میں اُردو زبان کے عدم چلن کی وجہ سے اُردو تہذیب متوسط درجے کے مسلم گھرانوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے، چھوٹے بڑے مشاعروں میں سامعین کی صفوں میں صرف ٹوپیاں ہی ٹوپیاں نظر آتی ہیں اور کلمہ گو سامعین کا جمِ غفیر مشاعروں کی عوامی مقبولیت کا بھرم رکھے ہوئے ہے۔ اسے دیکھ کر ''علمائے اُردو'' خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اُردو کو مختلف مذاہب کے لوگوں سے جوڑنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں۔ مشاعروں میں غیر مسلم سامعین کی شرکت کے بارے میں دعویٰ کرنا ایک فریبِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لال قلعہ کا مشاعرۂ جشنِ جمہوریت ہو یا دوسرے شہروں کے چھوٹے بڑے مشاعرے، سامعین کی عام صفوں میں ٹوپیاں ہی ٹوپیاں اور کلمہ گو حضرات ہی نظر آتے ہیں۔ جہاں تک ان مشاعروں میں غیر مسلم شاعروں اور شاعرات کی غزل سرائی اور شعر گوئی کی صلاحیتوں کا تعلق ہے۔ یہ طبقہ اُردو شاعری کے نام پر کاروبار میں مصروف ہے اور اُردو دنیا سے صرف جزیہ وصول کر رہا ہے۔

وسیم بریلوی کے بیان ''اُردو کو مشاعروں نے زندہ رکھا ہوا ہے'' کو ردّ کرتے ہوئے عظیم اختر کہتے ہیں کہ آج ہندوستان میں اُردو کو دینی مدارس اور پرائمری و سیکنڈری سکولوں کے وہ اساتذہ ہی زندہ رکھے ہوئے ہیں جن کو اُردو منظر نامے پر کوئی نہیں جانتا۔ اُردو کے یہ مشاعرے جن کے سر پر وسیم بریلوی اُردو کو زندہ رکھنے کا سہرا باندھتے ہیں اُردو زبان و ادب اور تہذیب سے ناآشنا سامعین کو سستی تفریح فراہم کرتے ہیں اور مشاعرہ باز شاعروں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان مشاعروں میں سخن شناسی سے محروم اور شعر فہمی سے کورے سامعین کی داد و ستائش اور پذیرائی نے آواز کے جوہر دکھانے والے گویّے شاعروں اور غزلیں گانے والی متشاعرات کے لئے روزی کمانے کے در کھول دیے ہیں، بلکہ ان کو مشاعروں کے لئے ناگزیر بھی بنا دیا ہے۔ آج کے مشاعرے ان ہی گویّے شاعروں اور غزلیں گانے والی

متشاعرات کے دم سے آباد ہیں۔ یہ شعر فہموں اور سخن شناسوں کا قحط الرجال اور اُردو زبان کا زوال ہے۔

۳۔سرکاری اور نیم سرکاری اداروں/اکیڈمیوں کا کردار

اُردو کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں اور اکیڈمیوں نے درحقیقت اُردو ادب کے حاشیے پر بیٹھے ہوئے نقادوں، محققوں اور پروفیسروں کی ہی پرورش کی ہے اور صحیح معنوں میں ان کے دن پھیر دیے ہیں۔ ان اداروں کی سربراہی حاصل کرنے والے پروفیسر نقادوں نے اُردو کے نادر مخطوطوں اور نایاب کتابوں کی اشاعت کی بجائے اپنی مرتب کر دہ کتابوں کی اشاعت پر خصوصی توجہ دے کر صرف اپنی مطبوعہ کتابوں کی فہرست میں اضافہ کیا ہے۔ ان اداروں کے ذریعے ایسی کتابیں بھی منصۂ شہود پر آرہی ہیں جن کو اُردو کا عام پبلشر ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ان اکیڈمیوں نے نام نہاد نقادوں محققوں اور ادیبوں کے پیٹوں کو تو بھر دیا ہے لیکن اُردو زبان کے تحفظ اور فروغ کو چھوٹے بڑے قصبوں اور درمیانی درجے کے شہروں کی گلیوں اور کوچوں میں اُردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

'قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان' کی بنیاد کا پہلا پتھر ہی شور زدہ زمین پر رکھا گیا ہے جس کے نتیجے میں آئین کے نام پر نہایت غفلت سے ایک ایسی دستاویز تیار کی گئی ہے جو صرف زعمائے ادب یعنی پروفیسر نقاد حضرات کے ذاتی اور ادبی مفادات کا بھرپور انداز سے تحفظ کرتی ہے۔ قومی کونسل کے عہدوں پر متمکن ''زعمائے ادب'' نے اپنے اپنے دور میں بھرپور انداز سے قومی کونسل کا استحصال کیا ہے اور اس ادارے کو اپنی تنقیدی کتابوں کا اشاعت گھر بنا کر رکھ دیا ہے۔ قومی کونسل سے اپنی کتابیں چھپوانے یا دوسرے لفظوں میں سرکاری خرچے پر کتاب چھپوا کر صاحبِ کتاب بننے کے اس شوق نے کونسل کے ہر بڑے عہدے دار کو مفت میں نہ صرف صاحب

کتاب بنا دیا بلکہ ہر سال رائلٹی کی شکل میں مالی منفعت کی سبیل بھی پیدا کر دی۔ ان میں سے مفت میں چھپی اکثر کتابیں معیار کو ترستی ہیں۔ دوست نوازی وہ گل کھلاتی ہے کہ معیار آنسو بہاتا رہ جاتا ہے۔

عظیم اختر کے اعداد و شمار کے مطابق قومی کونسل کے اربابِ بست و کشاد نے اپنے دوستوں اور حواریوں کی کتابیں چھاپ کر بدترین ادبی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ کونسل نے میرٹ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فلمی نغمہ نگار اور کہانی کار گلزار کی اکیس، شمس الرحمٰن فاروقی کی بارہ، گوپی چند نارنگ کی نو، مدن گوپال کی چوبیس اور مظفر حنفی کی بائیس کتابیں چھاپی ہیں۔ عظیم اختر کے مطابق گلزار، فلمی دنیا کے اور بہت سے دوسرے نغمہ نگاروں اور کہانی کاروں کی طرح ایک عام سے نغمہ نگار اور کہانی کار ہیں۔ ایک شاعر اور کہانی کار کی حیثیت سے ممکن ہے فلمی دنیا میں ان کا کوئی مقام ہو لیکن اُردو دنیا میں گلزار کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے۔ بدترین خویش پروری اور دوست نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے گلزار کی اکیس کتابوں کو قومی کونسل کی مطبوعات کے شوکیس میں سجا دیا گیا۔ گلزار کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی دوسرے ادیب ہیں جن کی ایک دو نہیں بلکہ بارہ کتابیں چھاپ کر قومی کونسل نے ایک ''گراں قدر'' فریضہ انجام دیا۔ اس پر ایک نیاز مند نے انکشاف کیا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ قومی کونسل نے بعینہٖ شائع کر دیا ہے۔ عظیم اختر کے مطابق ''اُردو کے اکابر پروفیسر حضرات'' نے ان سرکاری اداروں سے معاوضے کے طور پر خطیر رقمیں لے کر سکول کی سطح پر اُردو تعلیم کی ایسی نصابی کتابیں تیار کی ہیں جن کو پڑھ کر طلبہ میں شعر و ادب کا کوئی ذوق پیدا نہیں ہوتا۔ سکول کی سطح کے مرتب کیے گئے نصاب میں غلطیوں کی بہتات ہے۔ بدقسمتی سے زبان و بیان کا معیار بھی پست ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ ایسی ناقص اور غیر معیاری نصابی کتابوں پر احتجاج تو کجا ان کی نشاندہی بھی نہیں کی جاتی۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اُردو دنیا کی ''نامور شخصیتوں'' نے قومی کونسل برائے فروغِ

اُردو زبان کا عہدہ سنبھال کر اپنے ذاتی اور ادبی مفاد کے لئے اس ادارے کا ہمیشہ استحصال کیا ہے۔ اپنے منظورِ نظر پروفیسر نقادوں کو مالی فائدہ پہنچانے میں کبھی کوئی کمی نہیں کی لیکن حاکمانِ وقت سے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا کہ اُردو کو صرف وہ مقام دے دیا جائے جس کی 'گنگا جمنی تہذیب' اور عوامی رابطے کی زبان ہونے کے ناتے وہ مستحق ہے۔ ان اداروں کی کارکردگی اور تاریخ گواہ ہے کہ ان سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ الٹا ان اداروں نے اُردو زبان کو نقصان پہنچایا۔

۴۔اُردو صحافت کا کردار

صحافت اگر اخلاقیات اورا قدار سے منحرف ہوجائے تو پھر وہ مشن نہیں، مادیت کی مشین بن جاتی ہے۔صحافت کے آغاز ہی سے ایک ضابطۂ اخلاق کی پاسداری چلی آتی رہی ہے جس کی روشنی میں مدتوں مثبت اور صحت مند صحافت کی مشعل روشن رہی اور معاشرے میں اس کا اعتبار قائم رہا۔ صحافی اپنی تحریروں سے بڑا بنتا ہے اور عوام و خواص میں پہچانا جاتا ہے۔ ملک و ملت کے سیاسی، سماجی، معاشی، ملی اور قومی مسائل پر گہری نظر رکھنے اور اپنی فہم و بصیرت سے ان مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے صحافت کی ثقہ روایتوں کا احترام کرتے ہیں۔ دانشور صحافیوں نے صحافتی اخلاقیات کا تادمِ آخر خیال رکھا مگر اب صحافتی قدریں مسخ ہو چکی ہیں۔ صحافت میں اخلاقیات کی جگہ اب صارفیت نے لے لی ہے جس کی وجہ سے صحافت کا انسانی چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ صحافت اب خبروں کی تجارت بن گئی ہے اور تجارتی مفادات کا تحفظ ہی صحافت کا مقصدِ اوّلیں بن گیا ہے۔ صحافت صاحبانِ جاہ و ثروت کا سامانِ نشاط بن کر رہ گئی ہے۔ یہ صرف اشرافیہ اور اعلیٰ طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لئے ہے۔ صحافت کا گرتا ہوا معیار جہاں معاشرے کے زوال کا آئینہ دار ہے وہاں اُردو زبان کی تخریب کا باعث بھی ہے۔ اُردو اخبارات کے مدیر و مالک حضرات جس نہج پر اُردو کا استحصال کر کے اُردو صحافت کے نام پر پیسہ کما رہے ہیں اس کا اندازہ عام اُردو والوں کو نہیں

ہے۔اُردو صحافت کے نام پر ایک زبردست فراڈ ہو رہا ہے اور کچھ شاطر قسم کے مدیر و مالک حضرات جن کو صحافی کہنا صحافت کی توہین ہے، سرکاری اشتہارات جاری کرنے والی ایجنسیوں اور اداروں کے رشوت خور ملازمین سے مل کر اُردو کے نام پر پیسہ کما رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ آج کی اُردو صحافت میں ایسے صحافیوں کی کمی نہیں جو صحافت کی مبادیات سے بھی واقف نہیں، اتفاقات نے ان کو اس کوچے میں دھکیل دیا ہے اور وہ صحافی بن بیٹھے ہیں۔ زبان و بیان پر دسترس نعمتِ خداوندی ہے جس سے وہ محروم ہیں۔

جناب عظیم اختر ماضی میں لکھنؤ اور دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل و جرائد اور ان کے جیّد اور قد آور صحافیوں کی مثال دیتے ہیں جن کی سیاسی فہم و فراست اور صحافتی بصیرت کا زمانہ قائل تھا۔ ان اکابرینِ صحافت نے اپنے قارئین کی ذہنی تربیت کرنے کے لئے قلم کی حرمت کا پاس رکھا اور اخبارات کو اپنی شہرت و تشہیر کا کبھی ذریعہ نہ بنایا۔ لیکن آج کل اوسط درجے کی قابلیت اور ذہنی استعداد رکھنے والے ''مدیرانِ کرام'' نے صحافتی قدروں اور روایتوں کو بالائے طاق رکھ کر ذاتی شہرت حاصل کرنے کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

۵۔تحقیق کا معیار اور جعل سازی

ہندوستان کے دانش کدوں اور دانش گاہوں میں کئی پروفیسر صاحبان جعلی ڈگریوں کے سہارے مستقل ملازمت کر رہے ہیں اور الحمد للہ یہ اتفاق سے سبھی اہلِ ایمان ہیں۔ ڈگریوں کے بازار کھل چکے ہیں اور آپ کچھ دے دلا کر اپنی من پسند ڈگری خرید سکتے ہیں۔ جب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تقرر سے لے کر ترقی تک پی ایچ۔ ڈی ضروری قرار دی گئی ہو تو اس کی طلب یقیناً بڑھے گی خواہ اس کی علمی اور تحقیقی اہمیت کتنی ہی گھٹ جائے۔ اب مقصد ڈگری کا حصول ہے علمی کام نہیں۔ جن

لیکچررز کے لئے صرف ایک عدد ڈگری پیش کر کے اپنی ملازمت پکی کرنا مقصود ہو وہ ایک علمی مقالے کی تیاری میں اپنا سر کیوں کھپائیں گے؟ مقالہ نگاروں کو اپنے تحقیقی معیار کا خوب اندازہ ہوتا ہے اس لئے ننانوے فیصد مقالے چھپوائے نہیں بلکہ چُھپائے جاتے ہیں۔ یوں بھی جو مقالے علم و تحقیق کے میدان میں کسی اضافے کی بجائے صرف تنخواہوں میں اضافے کے لئے لکھے گئے ہوں، اُن کی اشاعت نہ ہو تو علم و ادب پر احسان ہی ہے۔

٦۔اُردو رسم الخط سے بے اِعتنائی

یہ سانحہ کسی بڑے المیے سے کم نہیں کہ ہندوستان میں اُردو رسم الخط لکھنے، پڑھنے اور جاننے والوں کی تعداد مسلسل تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ آدمی پڑھ، لکھ کر ہی زبان بولتا ہے، جس زبان کی اپنے رسم الخط میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ کبھی کا منقطع ہو چکا ہو، اس کے بولنے والوں کی تعداد کسی بھی حالت میں بڑھ نہیں سکتی۔ ہندوستان میں اُردو رسم الخط دیکھنے کو اب تو آنکھیں ترستی ہیں۔ مارچ ۲۰۱۵ء میں، دہلی میں جشنِ ریختہ منایا گیا جس میں پاک و ہند کے علاوہ اُردو دنیا کے نامور ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققوں نے شرکت کی۔ اس جشنِ ریختہ کے موقع پر اس کی تشہیری مہم دیوناگری رسم الخط میں کی گئی۔ اس جشن کی ساری کارروائی دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی تھی۔ جو اُردو شاعری اس جشن میں پیش کی گئی وہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی گئی۔ تمام بینرز اور اشہارات اُردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں تھے۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ کسی بھی اُردو کے ادیب نے اس پر احتجاج نہیں کیا۔ بازاروں، سڑکوں، پارکوں اور دفتروں میں کوئی بورڈ اُردو رسم الخط میں لکھا ہوا کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔ دینی مدارس اور مساجد میں پہلے سے ہی اُردو رسم الخط کی بجائے ہندی رسم الخط کا چلن عام ہو چکا ہے۔

۷۔فروغِ اُردو کے نام پر ادبی سرگرمیاں

اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ محض سیمینار، کانفرنس، ورک شاپ، مشاعرے اور اس قسم کی دیگر ادبی اور ثقافتی تقریبات ہی سے کسی زبان کو عوامی سطح پر فروغ دیا جاسکتا ہے اور اس زبان کی ترویج کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی لسانی تاریخ میں آج تک اس قسم کی ادبی اور ثقافتی تقریبات منعقد کر کے کسی بھی زبان کو نہ زندہ رکھا جاسکا ہے اور نہ ہی عوامی سطح پر فروغ دیا جاسکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قومی اور عالمی مشاعروں کی طرح اُردو کے نام پر عالمی اور بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کر کے عوامی پیسے کو مالِ مفت دلِ بے رحم کی طرح ٹھکانے لگایا گیا ہے۔ ایسا کر کے باہر کی دنیا میں رہنے والے اپنے قلمکار دوستوں کو مدعو کر کے احسان مند ضرور کیا جاسکتا ہے یا اسی بہانے نئے دوست پیدا کیے جاسکتے ہیں لیکن اُردو زبان کو فروغ نہیں دیا جاسکتا۔ کسی بھی زبان کا فروغ سکول کی سطح پر اس کی تعلیم و تدریس سے پیوست ہے۔ بنیادی طور پر کسی بھی زبان کی تعلیم اس کے فروغ کی ضامن ہوتی ہے اور اس بنیادی تعلیم کی وجہ سے اس زبان کے نئے لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے پیدا ہوتے ہیں۔

۸۔ادبی دُنیا کی تقسیم

ہندوستان کے ادبی منظر نامے کو دو صاحبانِ فکر و نظر نے کمالِ ہوشیاری سے آپس میں بانٹ رکھا ہے۔ ہندوستان کے بیش تر اہلِ علم و ادب، حتیٰ کہ رسائل و جرائد بھی، دو دھڑوں بٹ ہو چکے ہیں۔ ادیب اور دانش ور حضرات توصیفی اسناد حاصل کرنے کے لئے دونوں میں سے کسی نہ کسی کی ہم نوائی اور طرف داری کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہیں۔ وہ ادیب اور شاعر جو ادبی دنیا کی اس تقسیم کو نہیں مانتے وہ ادب کے حاشیے پر خاموشی سے کھڑے ہیں۔ ایک دوسرے کے مقابل علم و ادب کے یہ ''پہاڑ'' جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ اپنے آپ کو منوانے

کے جنون میں قائم کی گئی اس دھڑے بندی سے اردو کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچ رہا ہے۔

کچھ دیگر ادیبوں کا نقطۂ نظر

ہندوستان میں اُردو کی موجودہ صورتِ حال کو واضح کرنے کے لئے یہاں کچھ نامور ادیبوں کا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے۔ چند ایک ادیبوں کے خیالات باقی زیادہ تر ادیبوں سے مختلف ہیں۔ اس اختلافی نقطۂ نظر کی اپنی اہمیت ہے۔ اتفاق یا اختلاف کرنا دوسری بات ہے مگر صورتِ حال سے واقف ہونے کے لئے اسے سمجھنا ضروری ہے۔

- سیّد ظفر ہاشمی ہندوستان میں اُردو دنیا کا ایک بڑا نام ہے۔ ہاشمی صاحب شاعر، ادیب اور صحافی ہیں۔ ان کی زیرِ ادارت لکھنؤ سے ایک دو ماہی علمی اور ادبی جریدہ ''گلبن'' شائع ہوتا ہے جسے ادبی دنیا میں اعتبار اور مقام حاصل ہے۔ ہاشمی صاحب اُردو کی زبوں حالی پر کڑھتے رہتے ہیں اور اُردو کی محبت میں لکھ کر اپنی تہذیبِ نفس کرتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''کسی زمانے میں ٹکسالی زبان اس زبان کو کہتے تھے جو فصیح اور مستند ہوتی تھی اور جسے اہلِ زبان بولتے تھے۔ اُردو کا رشتہ ٹکسال سے اب بھی ہے لیکن نوعیت بدل گئی ہے۔ اب غیر مستند اور غیر فصیح ادب کا چشمہ ٹکسال سے نکلنے والے سکّوں اور کرنسی نوٹوں کی سرسراہٹ کے طفیل خس و خاشاک پر بھی پھوٹنے لگا ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ سستی اور وقتی شہرت کی ہڑک اور خود نمائی کی للک پر روک لگائی جائے ورنہ اچھے اور بُرے کی تمیز اٹھ جائے گی اور کسی تحریر کی عظمت، وقعت اور افادیت کو پرکھنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہ رہے گا۔'' (گلبن (لکھنؤ) ستمبر اکتوبر ۲۰۱۳ء ص ۶)

مزید کہتے ہیں:

''یو پی سے اُردو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے۔ اسلامی مدرسوں میں یہ

شمع ٹمٹمانے کی حد تک روشن ضرور ہے لیکن حال کی حکومتوں نے ان مدرسوں کی نام نہاد 'اصلاح' کا جو بیڑا اٹھایا ہے اور انھیں جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کا جو شوشہ چھوڑا ہے وہ یقیناً بدنیتی پر محمول ہے۔ نصاب کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہندی ذریعہ تعلیم رائج کرنے کی سازشی لہریں زیرِ آب چل رہی ہیں۔ کچھ سالوں سے ان مدرسوں کی رسیدیں ہندی رسم الخط میں بھی چھپوائی جاتی ہیں اور چندہ وصول کرنے والے مولوی صاحبان اندراج بھی ہندی میں کرتے ہیں۔ ہم نے ایسے کئی صاحبان سے دریافت کیا کہ وہ رسید اُردو میں کیوں نہیں کاٹتے؟ تو ان کا جواب تھا ''اُردو نہیں آتی''...... ہمارے دوسرے سوال پر وہ خاموش رہے اور سوال یہ تھا کہ جب آپ اُردو سے واقف نہیں تو مدرسوں میں تعلیم کس طرح دیتے ہیں۔ یوپی کی مسجدوں میں اب تختیاں ہندی رسم الخط میں لٹکتی دکھائی دیتی ہیں۔ دیواروں پر ہدایات اور فرمودات اور وظائف کے ترجمے دیوناگری رسم الخط میں لکھے جاتے ہیں۔ اس کے لئے جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ نمازیوں میں ہندی سب جانتے ہیں اور اُردو کوئی کوئی۔ سڑکوں، شاہراہوں، دفتروں اور عوامی مقامات سے تو اُردو غائب ہو ہی گئی ہے اب مدرسوں اور مسجدوں سے بھی انھیں بے دخل کر دیا گیا ہے۔''

(گلبن (لکھنؤ) مئی جون ۲۰۱۵-ص ۳)

- ہندوستان سے تعلق رکھنے والے ادیب، ڈاکٹر غلام نبی زرقانی امریکہ میں مقیم ہیں اور اُردو کی بابت لکھتے رہتے ہیں۔ وہ اس نظریے کے شدید مخالف ہیں کہ اُردو گنگا جمنی تہذیب کی آئینہ دار ہے:

''جب اُردو کی بنیاد رکھنے والے ہم (مسلمان) ہیں اور اس کی زلفیں سنوارنے والے بھی ہم ہی ہیں تو پھر اسے اپنا کیوں نہیں سمجھتے؟ ہم یہ کیوں کہتے ہیں کہ اُردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان

ہے؟ آخر ہمیں اپنی ہر دلعزیز اور مقبولِ عام زبان کو دوسروں کی گود میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت کا اُردو بولنا اور سمجھنا کیا یوں ہی اتفاقی کہلائے گا؟ یہ ہماری ہے اور ہمارے آباؤ اجداد کی شبانہ روز جدوجہد، تگ و دو اور متواتر کوششوں سے ہم تک پہنچی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم وطن غیر مسلم بھی اسے بولتے ہیں، لکھتے ہیں لیکن کسی زبان کو دوسروں کے اپنانے کی وجہ سے اس کی ملکیت تبدیل نہیں ہو جاتی۔ مجھے کہنے دیا جائے کہ اُردو بلاشبہ مسلمانوں کی زبان ہے اور ہمیں اس پر فخر ہونا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے اِسے ہم تسلیم کرنے میں کیوں ہچکچاتے ہیں؟''

(گلبن (لکھنؤ) جولائی اگست ۲۰۱۳-ص ۳۷)

- سیّد محمد مرتضٰی کریم سہروردی دہلی میں مقیم ہیں۔ اُردو زبان و ادب ان کا میدان ہے۔ اُردو کی زبوں حالی پر رقمطراز ہیں:

''زبانِ اُردو جو جدوجہدِ آزادی کے دوران اپنے کردار کی موثر ادائی کی بنا پر ملک کے ''سیکولر اقدار'' اور ''متحدہ قومیت کی روشن نمائندہ'' کے طور پر پہچانی جاتی تھی، چشم زدن میں قومی اور ملکی سطح پر زندگی کے تمام شعبوں سے عملاً خارج کر دی گئی ہے۔ آئینِ ہند کے معماروں نے دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو ملک کی سرکاری زبان بنا دیا۔ اُردو کے لئے یہ بڑا پُر آشوب دور ہے۔ ملکی سیاست میں در آئی فرقہ پرست ذہنیت کے گھناؤنے چہرے رفتہ رفتہ بے نقاب ہونے لگے ہیں اور اسی ذہنیت نے اُردو کے کاز کو آگے چل کر ہر ایک قدم پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ اُردو کو اپنے ہی وطن میں ایک غیر ملکی زبان قرار دینے کی سازش ہونے لگی ہے۔ ''اپنی جنم بھومی دوآبہ گنگ وجمن'' میں اُردو راندۂ درگاہ بن گئی ہے۔ بے یارو مددگار، بے پشت پناہ زبانِ اُردو پر زمین کی وسعتیں تنگ

ہونے لگی ہیں اور ہندوستان میں اُردو کا وجود ایک سوالیہ نشان بنتا جارہا ہے۔'' (گلبن (لکھنؤ) ستمبر اکتوبر ۲۰۱۶۔ص ۷۳)

- جھاڑکھنڈ سے جناب ارشد قمر اُردو کی زبوں حالی پر اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں:

''اُردو کی حالتِ زار کا ذمہ دار صرف اور صرف وہ طبقہ ہے جو ایک طرف تو اس کی شیرینی، اس کی لطافت اور اس کی عظمت کا دم بھرتا ہیں مگر دوسری جانب جب اُردو کو اس کے جائز حقوق دلانے کی بات کی جاتی ہے تب اُن کے ہاتھوں اس کا گلا گھوٹا جاتا ہے۔ اپنے مفاد پر اُردو کا سودا کرنے والوں نے اس کے حق میں کبھی کوئی عوامی تحریک نہیں چلائی۔ بہت ساری انجمنیں، اکیڈمیاں اور ادارے اُردو کے نام پر قائم کیے گئے۔ پر افسوس کسی نے کبھی اس کا حق ادا نہیں کیا۔ بلاشبہ جب تک مفاد پرستی، ضمیر فروشی اور بے غیرتی زندہ رہے گی یہی صورتِ حال قائم ہے اور قائم رہے گی۔''
(گلبن (لکھنؤ) مئی جون ۲۰۱۵۔ص ۲۰)

لکھنؤ سے جناب انجم عرفانی، اُردو کی موجودہ صورتِ حال کا ذمہ دار ایک خاص طبقے کو ٹھہراتے ہیں:

''سرکاری مسلمانوں' کا یہ طبقہ قدیم زمانے سے درباریوں کے لئے مشہور ہے۔ دمشق کا دربار ہو یا بغداد کا، فاطمی دربار ہو یا عثمانی، ہر عہد میں یہ لوگ چیونٹیوں کی طرح شاہوں کی ٹانگوں سے لپٹے رہے اور ملت کو بے پناہ نقصان پہنچاتے رہے۔ ہم کہاں تک ان کی خودغرضی اور منافقت کا ماتم کریں گے؟ اُردو دنیا کا عجب حال ہو چکا ہے۔ جہاں ذرا بھی مالی منفعت کی چاشنی نظر آئی اُردو کے نام نہاد دانشور گدھ کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مردار کھانے کے چکر میں اکثر آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ یہ تماشا تو آئے دن دیکھنے میں آتا ہے۔'' (گلبن (لکھنؤ) مئی جون ۲۰۱۵۔ص ۱۴)

- الٰہ آباد سے جناب ڈاکٹر ایس۔ آئی عثمانی اُردو زبان و ادب کی تاریخ کے استاد اور نامور ادیب ہیں۔ اُردو کی موجودہ صورتِ حال کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ''۱۹۵۲ء میں جب میں گورنمنٹ انٹر کالج الٰہ آباد میں زیر تعلیم تھا اس وقت اُردو میرے نصاب میں شامل تھی مگر آج کل جن بچوں کی مادری زبان اُردو ہے انھیں اس سہولت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ آج کسی بھی شخص سے جو پچاس سال سے زیادہ کی عمر کا ہو پوچھیے کہ اس نے اُردو پڑھنا لکھنا کہاں سیکھا تو وہ سکول ہی بتائے گا۔ والدین کے لئے اپنے بچوں کو گھر پر مادری زبان پڑھانا ممکن نہیں۔ اُردو دسویں درجہ تک نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔''

(گلبن (لکھنؤ) جنوری۔ اپریل ۲۰۱۳۔ ص ۱۱۳)

- پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا شمار ہندوستان کے اساطینِ اُردو میں ہوتا ہے۔ اُردو کے موجودہ منظر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہم اُردو والے شدید احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ یہی سوچتے ہیں کہ اُردو پڑھ لکھ کر ہمارے بچے کیا کریں گے؟ وہ لوگ جو اپنے بچوں کو اُردو بالکل نہیں پڑھاتے معاشی خوف سے، تو وہ شدید غلطی کرتے ہیں۔ یہ احساسِ کمتری ہے جو اُردو کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ اِس وقت ہمارے سامنے جو نسلیں آ رہی ہیں وہ ایسی گونگی بہری نسلیں ہیں جو اپنی زبان میں ٹھیک گفتگو نہیں کر سکتیں۔ اس کا تعلق ہمارے قومی احساسِ کمتری سے ہے۔''

(سہ ماہی کوہسار (بھیکن پور) شمارہ ۱۷۴، اپریل ۲۰۱۴ء۔ ص ٦)

- ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اُردو زبان و ادب کی ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ بھاگل پور یونیورسٹی میں اُردو کے استاد رہے۔ اُردو زبان وادب میں انھیں کثیر التصانیف ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

اُردو کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیاسی طور پر اُردو کا استحصال آزادی کے بعد ہوا۔ ہندوستان میں قومی زبان کون سی ہو اس پر ووٹنگ ہوئی تو اُردو اور ہندی کو برابر ووٹ ملے۔ صدر جمہوریہ راجندر پرساد نے اپنا صدارتی ووٹ ہندی کے حق میں دیا، اس طرح اُردو قومی زبان نہیں بن سکی۔ لیکن آج اکیسویں صدی میں المیہ یہ ہے کہ جن کی مادری زبان اُردو ہے وہ اپنے بچوں کے لئے اُردو کی بجائے ہندی کو ترجیح دے رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اُردو سمٹتی جا رہی ہے لیکن ہم نام نہاد اُرد والے اُردو کی جڑوں کی بقا کے لئے، تحفظ کے لئے، رابطے کے لئے، دائرۂ عمل کی وسعت کے لئے اور تنظیم و ترقی کے لئے سنجیدگی سے کیا کرر ہے ہیں؟ سیاسی پارٹیوں کے ذریعے اُردو کو دیس نکالا دینے کی سازشیں ہو رہی ہیں جن کے تدارک کے لئے ہم سوچتے بھی نہیں۔ آئندہ تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور تاریخی اثاثہ کی محافظت کیسے ہو سکے گی؟ جو اُردو زبان میں ہے، پہچان میں ہے اور ادب میں ہے اس پر آخر کون سوچے گا اور عمل پیرا ہو گا۔''

(سہ ماہی کوہسار (بھیکن پور) شمارہ ۱۷۴، اپریل ۲۰۱۴۔ ص ۴)

ٹانڈہ (بھارت) سے جناب شرافت حسین لکھتے ہیں:

''سرکاری مسلمانوں کے حوالے سے تو کہا جاتا ہے کہ خود اُردو والے اُردو کے دشمن ہیں۔ اُردو کے نام پر پیسے ہتھیانے والے اُردو کی نہیں خود اپنی خدمت کرتے ہیں۔ یہ لوگ اُردو کتابیں تو درکنار، اُردو رسائل و اخبار بھی خریدنا نہیں چاہتے۔ جن بڑے بڑے دینی مدرسوں کو سرکاری امداد مل رہی ہے وہ اُردو کی حق تلفی پر زبان نہیں کھول پاتے۔''

(گلبن (لکھنؤ) مئی۔جون ۲۰۱۵۔ص ۱۷)

- اُردو اکیڈمی دہلی کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے جریدے ''ایوانِ اُردو'' کے مدیر

(سال ۱۹۹۱ء) اپنا سرکاری نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں جس سے ہندوستان کے اہلِ ادب اتفاق نہیں کرتے، کیونکہ یہ سیکولر اور ہندو نواز مسلمانوں کا نظریہ ہے:

''...... یہ مفروضہ صحیح نہیں کہ اُردو صرف قرآن اور حدیث ہی کی تفسیر کی زبان ہے۔ اُردو مدتوں تک بول چال کی زبان رہی، تصنیف و تالیف کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا۔صرف قرآن اور حدیث کے تراجم اور تفسیریں ہی سامنے نہیں آئیں، دوسرے مذاہب کا لٹریچر بھی وجود میں آیا۔ پچھلے دنوں علی گڑھ یونیورسٹی نے ایک دو روزہ سیمینار مہرشی شوبرت لال برمن پر منعقد کیا تھا جنھوں نے سو سے زیادہ کتابیں ہندو دھرم کی ترویج و تشریح پر لکھیں۔ یہ کام انھوں نے اپنی بیوی کی فرمائش پر ہندو خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے شروع کیا تھا...... اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مسلموں نے محض معاشی ضرورتوں کے تحت اُردو کو اختیار کیا۔ جو زبان صرف معاشی یا کاروباری مقصد سے سیکھی جائے اس میں تخلیقی سرگرمیوں کا تصور محال ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ اُردو زبان میں غیر مسلم شاعروں اور ادیبوں نے اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا......اس سوال کا جواب کہ اُردو میڈیم سکول بالخصوص ان علاقوں میں کیوں کھولے جاتے ہیں جہاں مسلم آبادی زیادہ ہے، ہماری کوتاہ اندیشی کی خصلت ہے، اُردو پڑھنے کے خواہش مند ہر فرقہ میں موجود ہیں۔ اس کا اندازہ دہلی اُردو اکاڈمی کی طرف سے چلائے جانے والے کوچنگ مراکز سے مل کر کیا جاسکتا ہے جس میں ہر سال لگ بھگ نوّے فیصدی غیر مسلموں کی رہتی ہے......''

(گلبن (لکھنؤ) جولائی۔اگست ۲۰۱۳ء۔ص۱۰)

○ اب جناب عظیم اختر کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو ان کا حتمی

نقطۂ نظر ہے:

''یہ بات تلخ ہے، ممکن ہے بہت سے دوستوں کو ناگوار گزرے، مگر سچائیاں قلم بند کرتے ہی رہنا چاہیے۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اُردو کبھی بھی ہندوستانی سماج کے مختلف طبقوں کی 'مشترکہ زبان' نہیں رہی۔کوئی کچھ کہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو کو تقسیم وطن سے قبل ہندوستانی سماج کے ایک خاص طبقے نے اپنے آباو اجداد کی میراث سمجھ کر اور قرآن و حدیث کی تفسیر کی زبان کے طور پر گلے لگایا لیکن اسی سماج کے دوسرے طبقے کے افراد نے اسے کاروباری، معاشی اور اسی قسم کی دوسری ضرورتوں کے تحت اُردو کو اپنایا،لیکن فاصلہ قائم رکھا......تقسیم وطن کے بعد یہ ضرورتیں اور ترجیحات یکسر بدل گئیں جس کے نتیجے میں تمام کا تمام منظر نامہ ہی بدل گیا۔ اگر یہ زبان ہندوستانی سماج کے طبقوں کی مشترکہ زبان ہے تو صرف ایک مخصوص طبقہ کی آبادی والے علاقوں میں ہی اُردو میڈیم سکول کھولنے کا کیا جواز پیش کیا جاسکتا ہے......''

(گلبن (لکھنؤ) جولائی۔اگست ۲۰۱۳۔ص۱۰)

- آخر میں گوڑ گاؤں سے اُردو کے ادیب رام پرکاش کپور، جناب عظیم اختر اور اُردو ادیبوں کے اکثریتی نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے مسکت جواب دیتے ہیں جس میں فکرونظر کا وافر سامان موجود ہے:

''اُردو کے کچھ ادیبوں، دانشوروں نے خاص طور پر ان لوگوں نے جو اُردو کے ذریعے اپنی روزی کماتے ہیں، اُردو سے اچھا سلوک نہیں کیا۔مسلمانوں کا رویہ بھی اُردو سے بے حسی ہی کا ہے۔ اُردو کو قرآن اور حدیث کی تفسیر کہنے والے بتائیں کہ مسلمان اس کو مذہبی فریضہ سمجھ کر کیوں نہیں پڑھتے؟ آزادی کے بعد سکول جانے والی تین چار نسلوں کے لوگ اُردو رسم الخط سے کیوں بے بہرہ ہیں؟ اگر اُردو صرف

مسلمانوں کی زبان ہے جس پر وقتاً فوقتاً وہ حق مالکانہ بھی جتاتے ہیں
اِسے ان کے بچے کیوں نہیں پڑھتے؟ اگر سکولوں میں اُردو پڑھانے
کا انتظام نہیں ہے تو گھر میں کیوں نہیں پڑھاتے جس طرح قرآن
گھر میں ہی پڑھاتے ہیں۔ اُردو کے زیادہ تر نقاد، ادیب، صحافی اور
انجمنوں کے سربراہ سب اپنے ذاتی مفاد میں ہی دلچسپی کیوں رکھتے
ہیں؟ اُردو کی ترویج و ترقی اور بقا کے لئے کوشش کیوں نہیں کرتے؟
تمام اکادمیوں، اُردو انجمنوں اور اداروں کا کنٹرول ایسے لوگوں کے پاس
کیوں ہے جو صرف مصلحت اور منافقت سے کام لیتے ہیں؟ جس پارٹی
کی بھی حکومت ہو ان کی کرسی کیوں مستحکم رہتی ہے؟''

(گلبن (لکھنؤ) جولائی۔اگست ۲۰۱۳ء۔ص ۱۱)

●●●

''اُردو زبان'' کوئی بے کار سا کھلونا نہیں ہے

پچھلی تین صدیوں میں اُردو کے وجود کا تسلسل، ہمارے قومی وجود کے تسلسل کی تاریخ ہے۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کی بقا ایک ملک اور ایک قومی زبان کا تقاضا کرتی ہے۔ قوموں کی تاریخ نے ہمیں ایک بڑا سبق یہ دیا ہے کہ سیاسی آزادی، ذہنی آزادی کے بغیر بے کار ہے اور ذہنی آزادی کے پھول صرف قومی زبان کے باغ میں کھلتے ہیں۔ اُردو ہماری قومی زبان ہے جس کے بغیر ایک ملک اور ایک قوم کا دعویٰ مہمل سا معلوم ہوتا ہے۔ چند سال قبل سرکاری اثر و رسوخ کے زیر سایہ، وطنِ عزیز کے نام نہاد روشن خیالوں کے ایک گروہ نے ہنگامہ بپا کیا کہ اُردو کے مقابل تمام پاکستانی زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دے دیا جائے۔ فروری ۲۰۱۷ء میں، پاکستانی زبانوں کے تعلق سے اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد کے زیر اہتمام دو روزہ سمپوزیم کا انعقاد ہوا جس میں پاکستانی زبانوں کے درد میں گھُلنے والے دین اور وطن بیزار ''دانش وروں'' نے اُردو کے متعلق اپنے خُبثِ باطن کا کھُل کر اظہار کیا۔ قدرت کا تماشا دیکھیے! وہ لالچ خورے جو ساری عمر اُردو کا کھاتے رہے، اُردو کے بل بُوتے پر عہدے اور مناصب حاصل کرتے رہے، حکومتی وزیروں کی موجودگی میں، اُردو کے دشمنوں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور اُردو کے دفاع میں بولنے کی اُنھیں توفیق نہ ہوئی۔ قومی زبان کی محبت میں، چند دیوانوں نے اُردو کا مقدمہ اِخلاص اور دردِ دل

سے پیش کیا جن میں ڈاکٹر رؤف پاریکھ اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی نمایاں تھے۔ اُن کی توانا آواز کے ساتھ راقم کی کمزور آواز بھی شامل تھی۔ راقم نے اپنی باری آنے پر کہا:
''اُردو کی مخالفت میں کمر بستہ یہ حضرات اصل میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں، خلطِ مبحث کے ذریعے نئی نسل کو اُردو کے بارے میں گمراہ کرنے کی چالیں چل رہے ہیں، حالاں کہ یہ حضرات حقائق کا اِدراک رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اردو کو، پاکستان کی قومی زبان کی حیثیت سے کیوں بلند مرتبے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے؟ قائد کی بصیرت سے متعلق اِنھیں شرحِ صدر ہے اور یہ سب حضرات جانتے ہیں کہ قائد کو اُردو کی اہمیت اور قوت کا اندازہ تھا......مگر کیا کیا جائے کہ کتمانِ حق کا رویہ اِن حضرات کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ ہر ملک کی قومی زبان اس کے قومی تشخص کی آئینہ دار ہوتی ہے۔قومی زبان اور قومی تشخص آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ یہ لوگ کیا جانیں قومی تشخص کیا ہوتا ہے؟ یہ لوگ تو پاکستان میں ستّر (۷۰) سے زیادہ بولی جانے والی پاکستانی زبانوں کو ''قومی زبان'' کا تاج پہنا کر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ستّر (۷۰) سے زیادہ قومیں آباد ہیں اور پاکستان کے ستّر (۷۰) سے زیادہ قومی تشخص ہیں۔''

اِن میں سے بعض نام نہاد ''روشن خیال'' میرے جذبۂ حُبّ وطن کو ''عشقِ اُردو'' سے تعبیر کرکے ناراض ہوئے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ملامت کا کوئی حربہ اُن اربابِ ہمت کے خلاف کارگر نہیں ہوسکتا جو کسی بڑے مقصد کو سامنے رکھ کر سیدھے راستے پر چل رہے ہوں۔ ''قومی زبان'' کوئی بے کار سا کھلونا نہیں ہے کہ جی چاہا تو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ یہ ہماری قومی اجتماعی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے جسے پورا کیے بغیر پاکستانی معاشرے کی تشکیل و تکمیل ممکن نہیں۔ زندہ قوموں کی روایت ہے کہ وہ اپنی زبان، اعلیٰ روایات اور تہذیب و ثقافت سے محبت کرتی ہیں۔ ایک فرد، روح اور بدن کے باہمی ربط سے زندہ رہتا ہے لیکن قوموں کی زندگی میں دیگر کئی عوامل کے علاوہ

’زبان‘ایک توانا عامل ہوتی ہے۔ ہر متحرک قوم اپنے لسانی سرمائے کو زندہ رکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ اُردو زبان و ادب نے نہ صرف یہ کہ تحریکِ پاکستان میں حصّہ لیا بلکہ اِس وقت بھی قومی ہم آہنگی کے فروغ میں اہم کردار ادا کررہی ہے۔ اُردو کا تحفظ برّعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی جنگِ آزادی کا ایک مستقل حِصّہ رہا ہے۔تحریک پاکستان کا محرکِ اوّل اگر اسلام تھا تو محرک دوم اُردو زبان تھی۔

قومی وحدت کی تعمیر کے لیے افرادِقوم کا ہم خیال ہونا اور ہم خیال ہونے کے لیے ہم زبان ہونا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان کا فرق دلوں کے فرق پیدا کر دیتا ہے لیکن ہم زبانی ہم دِلی کی پہلی شرط بن جاتی ہے۔اس کی ایک زندہ مثال پرغور کیجیے کہ پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر امریکا عالمی سیاسیات سے الگ رہنے کی حکمتِ عملی پر کاربند تھا۔ جرمنی نے برطانیہ کو جب بُری طرح آن گھیرا تو امریکا اپنے پرانے اُصول ترک کرکے برطانیہ کی حمایت کے لیے جنگ میں آشامل ہوا۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان ہم جہتی کی بنیاد اُن کی مشترک زبان پر قائم ہے اور آج بھی یہ کیفیت ہے کہ یہ دونوں الگ ملک ہونے کے باوجود ایک معلوم ہوتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو انسانی جماعتوں کے درمیان اشتراکِ زبان ایک نعمتِ خداداد ہے جس کی قدر کرنا عین مُقتضائے فطرت ہے۔ یک زبانی قوم کی وحدت و سالمیت کے استحکام کا باعث ہوتی ہے۔کسی مشترک زبان کا نہ ہونا قوم کی وحدت کے لیے اُسی طرح ضُعف کا باعث ہوتا ہے جس طرح عقیدے یا نسل کا اختلاف۔

پاکستانی زبانوں بالخصوص سندھی، پنجابی اور پشتو کے کچھ نام نہاد ادیب اور دانش ور اُردو کو نیچا دکھانے کے درپے رہتے ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں ہونے والی قومی مردم شماری کے دنوں میں، اِنھوں نے اپنی اپنی زبان کے حق میں، گشتی فون اور سوشل میڈیا کے ذریعے بہت پیغام رسانی کی۔ ایسا کرنا ہر کسی کا حق ہے جس سے انکار ممکن نہیں، مگر جب زور دار مہم چلائی جائے کہ صرف پنجابی لکھو، پنجابی پڑھو اور پنجابی بولو تو اس کا

مطلب سوائے اُردو دشمنی کے کچھ اور نہیں۔ یہ عناصر ہمہ وقت اور ہر جا اُردو کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے میں 'مبتلا' رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک ''دانش ور'' سے میرا سامنا ہوا تو موصوف نے اپنی گفتگو میں اُردو کے خلاف نفرت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اِن لوگوں کو کیسے سمجھایا جائے کہ پاکستانی زبانوں کی ترقی، اُردو ہی کی ترقی ہے کیونکہ پشتو، سندھی، پنجابی اور اُردو سب ایک ہی تہذیبی روایت کی زبانیں ہیں۔ اس کے برعکس رُوسی اور تُرکی، رُوسی اور فارسی وغیرہ کے درمیان اس قسم کا کوئی تہذیبی اور تاریخی تعلق موجود نہیں ہے۔ پاکستان کی علمی وادبی روایت شمال سے جنوب تک ایک ہے اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ یہاں کسی ایک زبان کا فروغ کسی دوسری زبان کو نقصان پہنچائے۔ اگر اعتراض ہے تو اُس ذہنیت پر جو اُردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کے قریبی تعلق کو ختم کر کے قوم کے مختلف طبقوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دینا چاہتی ہے۔ اتحاد کی جو دولت ہمیں ایک مسلسل تاریخی عمل کے ذریعے حاصل ہوئی اُس کو تلف کرنے کی کوشش پر خاموش رہنا کسی صحیح العقیدہ انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

پنجابی زبان و ادب کے اُس نام نہاد ''دانش ور'' کو کیسے سمجھایا جائے کہ اُردو کو سب پاکستانی زبانوں پر یکساں حق حاصل ہے لیکن پنجابی کے ساتھ اس کا تعلق اتنا قریبی ہے کہ پنجابی کے لغات ومحاورات کا اُردو میں کھپ جانا کسی کاوش کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ ادب زندگی کے ہنگامے سے الجھا رہے تو زندہ رہتا ہے ورنہ مر جاتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کو کتابوں سے نکال کر کوچہ و بازار میں لانے کی ضرورت ہے۔ ہماری عوامی، دیہاتی اور شہری زندگی کے کئی پہلو ایسے ہیں جو لفظوں کے قالب میں جلوہ گر ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔ یہ عمل ذوقِ سلیم کی روشنی میں بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا سکتا ہے۔

ظہورِ پاکستان سے لے کر اب تک 'اشرافیہ' اُردو کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان کے سب مقتدر ادارے 'اشرافیہ' کے بطن ہی سے پیدا

ہوئے ہیں۔ اِس نے غلامی کے طوق ’انگریزی‘ کو ابھی تک حرزِ جاں بنایا ہوا ہے۔ اِس کے حواس پر یہ خوف ابھی تک مُسلّط ہے کہ اُردو کی ترویج و ترقی سے عوامی شعور فروغ پائے گا، جمہوری سوچ پروان چڑھے گی اور مثبت رویے تشکیل پائیں گے جس سے عشروں سے قائم اُس کی بالا دستی ختم ہو جائے گی۔ عقل کی اندھی اشرافیہ کو یہ احساس نہیں ہے کہ ہمارے ہاں پڑھائی جانے والی انگریزی زبان کی بنیادوں میں ہماری قومی زندگی کی حرکت شامل نہیں ہے۔ نفاذِ اُردو کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہمارا ملک ابھی تک قومی اتحاد اور سیاسی استحکام کا محتاج ہے۔ قومی زبان میں تعلیم اس خلا کو پُر کرنے میں مدد دے گی۔ قوموں کی بقا ایک ملک اور ایک زبان کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر اُردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دیا جائے تو نہ صرف انگریزی کا غیر ضروری دخل جاتا رہے گا بلکہ خالص علمی اعتبار سے درس و تدریس کا معیار بلند ہو جائے گا۔ ہماری تعلیم میں انگریزی زبان و ادب کو جو ہمہ گیر فوقیت دے دی گئی ہے وہ ہمارے ذہنوں پر غلامی کی ایک مستقل مُہر بن کر ثبت ہو گئی ہے۔ ہمارے ذہنوں سے غلامی کے داغ اُس وقت تک نہیں دُھلیں گے جب تک انگریزی کی حاکمیت کا طوق ہمارے گلے سے اُتارا نہیں جائے گا۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنی تہذیب وتمدن کی عظمت کو بھی ایک غیر زبان کے پیمانوں سے ناپ رہے ہیں جس کی بنا پر ہماری نژادِ نو اس کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف ہے۔ اس کا شدید نفسیاتی اثر یہ ہوا ہے کہ ہم من حیث القوم احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

انگریزی پر غیر ضروری انحصار بے تدبیری ہے اور خواہ مخواہ کی مشکل پسندی بھی۔ ہم روزمرہ کے مشاغل میں ایک ایسی زبان سے کام لے رہے ہیں جو ہماری تہذیب وتمدن سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے بے محابا استعمال سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ روشنی صرف مغرب سے طلوع ہوسکتی ہے۔ قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کا کوئی اس سے بڑا ذریعہ شاید ہی ممکن ہو۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ

غیر زبان کا ذریعۂ تعلیم و اظہار ہونا طالبِ علم کے فطری ذہنی تموّج کو روک دیتا ہے۔ انگریزی زبان میں تحصیلِ علم، باہر سے اندر آنے کا عمل یعنی محض قبولِ معلومات کی ایک صورت ہے۔ اس کے برعکس تخلیقی فکر کا چشمہ ہمیشہ اندر سے اُبلتا ہے۔ وہ معلومات جو آپ طالبِ علم کو انگریزی زبان میں دے رہے ہیں اُسے اپنی قومی زبان اُردو میں دیں تو تخلیقی فکر کا اندرونی عمل خود بخود تعلیم کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ اپنی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے بغیر ہماری قوم بدستور گونگی رہے گی اور موجودہ ذہنی انتشار میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ جب تک ہماری تعلیم اس بنیادی انقلاب سے روشناس نہ ہوگی فکری اجتہاد کا عمل شروع نہیں ہوگا اور جب تک فکری اجتہاد کا عمل شروع نہیں ہوگا اس وقت تک ہماری رسائی نہ کسی زندہ قومی تہذیب تک ہوگی نہ کسی زندہ قومی تمدن تک۔

یہ 'اشرافیہ' ہی کا پھیلایا ہوا مذموم خیال ہے کہ اُردو کا وظیفہ محض تخلیقِ شعر و ادب ہے اور جدید سائنس کے لیے ہماری قومی زبان اُردو کا ذریعۂ تعلیم ہونا ممکن نہیں، اس کام کے لیے صرف انگریزی ہی مکتفی ہے۔ یہ خیالِ باطل جھوٹ اور مبالغہ ہے جسے 'کمالِ فن' سے سچ بناکر پیش کیا جاتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی فکر کا ظہور اور فروغ قومی زبان اُردو کو ذریعۂ اظہار بنائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تعلیم کا پورا عمل، زبان کے سہارے سرانجام پاتا ہے جس سے سائنس آزاد ہے نہ ادب۔ زبان کا تعلق ادب سے بھی ہے اور سائنس سے بھی۔ الفاظ کی مدد سے متخیّلہ کے تصورات ہی نہیں بُنے جاتے، فکرِ طبعی کے تعقّلات بھی لفظوں ہی کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں۔ ہماری قومی زبان اُردو، بحمد اللہ اتنی ثروت مند ہے کہ اپنی نثر میں سائنسی مضامین کے لیے مبالغے اور غیرضروری لفظی آرائشوں سے پاک ایک مناسب اُسلوب بیان وضع کرسکتی ہے جس کے ذریعے علمی مطالب کا بلاکم و کاست اظہار ہوسکتا ہے۔

ہمارے آج کے اُن اُردو اساتذہ، اہلِ نقد اور ادیبوں کی تعداد میں خطرناک حد تک کمی ہو رہی ہے جو بے عیب زبان لکھنے اور بولنے پر قادر ہیں۔ بات سچ اور

کڑوی ہے مگر سچ بات یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اخبارات و کتب اور مجلّات و رسائل اُٹھا کر دیکھ لیجیے لسانی اور صرفی و نحوی غلطیوں کا ایک انبار نظر آئے گا۔ اگر کسی لفظ کے صحیح تلفظ اور درست استعمال سے آگاہ کیا جائے تو بحث مباحثے اور کٹ حجتی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کا مَوقِف ہے کہ قواعد کی پابندیاں اُردو زبان کی ترقی کے لیے سدِّ راہ ہیں۔ ایسی سوچ رکھنے والے ''ادیبوں'' کی طرف سے یہ مَوقف بھی دُہرایا جارہا ہے کہ اُردو سے عربی اور فارسی کا 'غازہ' اتار دینا چاہیے کیونکہ اردو میں مستعمل عربی، فارسی الفاظ اور قواعد اس کی توسیع میں رکاوٹ ہیں۔ نہیں معلوم اس طرح سوچنے والے کہاں سے یہ عقل کشید کرتے ہیں جس کے تحت وہ اُردو کے عظیم ادبی سرمائے کے ساتھ ساتھ مربوط اور توانا عروضی نظام سے محروم ہونا چاہتے ہیں۔ اُردو، دنیا کی خوش نصیب زبان ہے جو براہِ راست مختلف سرچشموں سے سیراب ہوتی ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کی زبان علمی طور پر صرف سنسکرت سے فیض یاب ہوتی ہے اور سنسکرت ایک مردہ زبان ہے۔ اس کے برعکس اُردو سنسکرت کے علاوہ دنیا کی دو نہایت ترقی یافتہ زبانوں عربی اور فارسی سے مستفید ہے اور خوش قسمتی یہ ہے کہ یہ دونوں زبانیں زندہ ہیں۔ ہمارے اکثر علمی الفاظ عربی سے اور تہذیبی الفاظ بیش تر فارسی اور ترکی سے ماخوذ ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ چشمے ابھی خشک نہیں ہوئے۔ علمی حیثیت سے اُردو کو مستقبل قریب میں فارسی سے اور بالخصوص عربی سے روز افزوں رابطہ پیدا کرنا ہوگا۔ اُردو میں فارسی کے تمام لاحقے اور سابقے، عربی کے تمام قواعدِ اشتقاق خوش اُسلوبی سے استعمال ہوتے ہیں۔ عربی اور فارسی ہماری علمی اور تہذیبی زبانیں ہیں، اُردو ہی ایک زبان ہے جو اِن کے علمی اور تہذیبی خزانوں کا دروازہ پھر ایک بار ہم پر کھول سکتی ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے ادیبوں کی اکثریت نے قوم کی امنگوں کا ترجمان بننے کے بجائے فقط اپنی ذاتی نجات کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اپنی انفرادیت کے شیش محل کو ایک محدود حلقے کی زیارت گاہ بنانا فی نفسہٖ ایک ہنر ہے، لیکن قوم کے سوادِ اعظم کے دل پر خدا کی آواز بن کر گرنا ایک بلند تر کمال کا ثبوت ہے۔ کسی تہذیب کے فکر وفن اور اُس تہذیب کی زبان کا باہمی تعلق جان وتن کا تعلق ہے اور اِن دونوں کی علیحدگی کا نتیجہ فکروفن اور زبان دونوں کے لیے برابر ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی قوم کے مذہب کو اُس کی تہذیب کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن مذہب اور تہذیب ایک چیز کے دو نام نہیں ہیں۔ کسی ایسی تہذیب کا تصور ممکن ہی نہیں ہے جو مذہبی اعتقادات کے کسی نہ کسی سلسلے پر مبنی نہ ہو۔ ہماری قومی تہذیب جس ذہنی پس منظر میں ابھری ہے اُس کا سب سے نمایاں عنصر دین اسلام ہے۔ ہمارا دینی عقیدہ بعض دوسرے مذہبی عقائد کی طرح 'پُر اسرار'، دُھندلا اور خواب ناک نہیں ہے، یہ ہمارے صحنِ مسجد کی طرح کُھلا اور روشن ہے۔ پاکستانی قومیت کی بنیاد ایک دینی عقیدے پر قائم ہے مگر اقبالؔ کے بعد اُردو ادب میں اس دینی عقیدے کا سراغ لگانا کچھ ایسا آسان نہیں رہا۔ اس سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہمارے ادیبوں نے شریعت کے اوامرونواہی پر نظمیں، افسانے یا ڈرامے کیوں نہیں لکھے، لیکن جن معنوں میں یہ کہا گیا ہے کہ انگریزی ادب کے بہترین حصے کا مفہوم مسیحیت کی روشنی میں واضح ہوتا ہے اُنھی معنوں میں پاکستانی ادیبوں کے تخلیقی کام سے اسلام کی حقانیت پر گواہی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

آج کے دور میں اپنی قومی زبان ''اُردو'' کو زندہ رکھنے اور اسے بگڑنے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کی محبت اور عزّت کا جذبہ نئی نسل کے دلوں میں پیدا کیا جائے۔ اُسے باور کرایا جائے کہ اُردو صرف میٹھی زبان ہی نہیں ہے، دنیا کی سب اچھی باتیں اور اونچے خیالات اس میں بیان ہو سکتے ہیں۔ ابتدائی جماعتوں ہی سے اُردو زبان دانی کا معیار بلند کیا جائے۔ نژادِ نَو میں اس کا شعور پیدا کیا جائے، اُردو سکھائی جائے، اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ یہ عمل مناسب راہنمائی،

حوصلہ افزائی اور سب سے بڑھ کر اِستقامت کا متقاضی ہے۔ وطنِ عزیز پاکستان میں جوہر کی کمی نہیں، راہنمائی، سرپرستی اور جذبے کی کمی ہے۔ تربیت کے طور پر، نئی نسل کے ذہنوں میں یہ حقیقت بھی راسخ کر دی جائے کہ دینِ اسلام کے بعد اگر کوئی چیز وطنِ عزیز پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھ سکتی ہے تو وہ ''اُردو زبان'' ہے۔ قومی زندگی کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے قومی زبان کے بنیادی اور کلیدی کردار کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک

ٹیلی وژن پر خبریں پڑھنے والی خاتون نے موسم کا حال بتاتے ہوئے کہا......
''کل قیامت کی گرمی پڑے گی''۔ چینل بدلا تو وہاں بھی موسم کا حال سنایا جارہا تھا......
''کل آسمان آگ برسائے گا''۔ قیامت سے پہلے قیامت اور دہکتے ہوئے انگاروں کی بارش کا سن کر، کسی اور چینل پر جانے کی ہمّت نہ رہی۔ راقم یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ ذرائع ابلاغ کی اضطراب انگیزی خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے اور لوگوں کو ذہنی، نفسیاتی اور اعصابی مریض بنا رہی ہے۔ درجنوں ٹیلی وژن چینلز مسابقت کی بیماری میں مبتلا ہیں اور درجہ بندی (Rating) میں اوپر جانے کے لیے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ یہ تشہیری مہم جہاں حرف و لفظ کی حُرمت پامال کرتی ہے وہاں فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک اچھے بھلے لوگوں کو مرعوب اور گمراہ کررہی ہے۔ نشر و اشاعت کے فنی اکتسابات میں جو چیز سب سے زیادہ زُود یاب ہے وہ لفظی صنعتوں کی یہی مذموم فراوانی، اِستعارات کی یہی شعبدہ بازی اور زبان کی یہی چرب کاری ہے جس کا آوازہ دنیا میں اتنا بلند ہے۔ نشر و اشاعت کی اس چمکیلی دنیا میں صحتِ بیان اور لفظوں کا محتاط استعمال عنقا ہو چکے ہیں۔ لفظوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت تصور کرنے کے بجائے کوئی گری پڑی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔

اِدھر ادب کی شہرت پرست دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ لفظوں کے اِسراف

کا ایسا غدر مچا ہوا ہے کہ الامان والحفیظ۔ بیش تر ادیب لفظوں کے تھوک بیوپاری نظر آتے ہیں۔ ذرا غور وفکر کے ترازو میں اِن کی تحریر تو لیے تو کلو بھر لفظوں میں سے دس گرام معنی برآمد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ کسی چیز کا اِسراف اُس چیز کے ساتھ ایک طرح کی زیادتی ہے۔ اگر آپ لفظوں کے اِسراف کے عادی ہو گئے تو عجب نہیں کہ ایک دن آپ کے لفظوں سے معنی ہی کم ہو جائیں۔[۱] انسانوں کی طرح لفظ بھی دوستی اور دشمنی کرتے ہیں، عقل وفہم اور احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لفظوں کو استعمال کیا جائے تو یہ بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ جس نے لفظ ومعنی کی ریاضت کا حق ادا کیا ہو تو لفظ ایسے لوگوں کے خود تابع ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات لفظ بھی آ بگینے کی صورت سامنے آتے ہیں، اِن کے استعمال میں آپ ذرا چُوکے کہ انھوں نے فوراً آپ کی قلعی کھول دی۔

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایسی نعمتیں جو انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں اُن کی قدر سے ہم بالعموم غافل رہتے ہیں۔ میرے نزدیک کوئی نعمت لفظوں کا بدل نہیں ہوسکتی۔ آپس میں بات چیت کرنے کی استعداد بہت بڑا عطیہ ہے جس کے بغیر جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اگر الفاظ نہ ہوتے تو نہ شعر ہوتا نہ فلسفہ، نہ سائنس ہوتی نہ طرح طرح کی ایجادات، نہ انسان صحیح معنوں میں خدا کو پہچانتا نہ خود اپنی انسانی نسل کے بھائیوں اور بہنوں کو۔ اچھی زندگی ہمیں لفظوں کے طفیل نصیب ہوئی۔ لفظوں جیسی نعمت سے ہم جس بے پروائی کا سلوک کرتے ہیں وہ کفرانِ نعمت ہے۔ [۲] لفظوں کے ناواجب استعمال سے نہ ہمارا بھلا ہوتا ہے نہ دوسروں کے پلّے کچھ پڑتا ہے مثلاً اس جملے کو دیکھیے: ''فلاں پروگرام میں وزیر صاحب نے کُرسیِ صدارت کو زینت بخشی'' ...... یہ صریحاً لفظوں کا ناواجب استعمال ہے۔ اس جملے کا کسی غیر زبان میں ترجمہ کریں تو اندازہ ہو گا کہ یہ قول کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اُردو کو اُس عذاب سے نجات دلوائی جائے جو جاگیرداری دور سے بطور ورثے کے اسے ملا

ہے جس نے نیک و بد کی تمیز اور حقیقی و غیر حقیقی کی پہچان ہم سے چھین لی ہے۔ ''کُرسیِ صدارت پر رونق افروز ہونا''یا ''کرسیِ صدارت کو زینت بخشنا'' جیسی زبان ہمیں ترک کرنی ہوگی تاکہ ہم زبانوں کی عالمگیر برادری میں شامل رہ سکیں۔

لوگ لفظوں کا اچھا یا بُرا استعمال کرتے ہیں تو سننے والے اس استعمال کی اچھائی یا بُرائی سے بے خبر رہتے ہیں۔ یہ جاننے کی زحمت گوارانہیں کرتے کہ دوسرے شخص نے کوئی اچھا جملہ کہا یا بُرا، صحیح زبان استعمال کی یا غلط۔ بعض مقرر جلسے میں اُلٹے سیدھے لفظ لُڑھکانا شروع کر دیتے ہیں اور سادہ لَوح سامعین جھوم جھوم کر کہتے ہیں ''واہ سبحان اللہ! حضرت نے کیا اچھی تقریر کی''۔ یہ مضحکہ خیز صورت اس لیے پیش آتی ہے کہ بعض لوگ لفظوں کے آب و رنگ اور چمک دمک سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں چمکیلے لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں چمکیلا لفظ جڑ دیتے ہیں اور آرائشِ بیان سے وہاں کام لیتے ہیں جہاں طبیعت بے اختیار سادگی اور برجستگی کا تقاضا کرتی ہے۔ الفاظ ہیرے اور جواہرات ضرور ہیں مگر صرف اُن لوگوں کے لیے جو موتیوں کی طرح ان کی قدر کرتے ہیں، قدر ناشناسوں کے دامن میں اِن موتیوں کو راکھ بنتے دیر نہیں لگتی۔ [۳]

بسا اوقات لفظ بھی ابنِ آدم کی طرح دشمنی پر اُتر آتے ہیں۔ جو ادیب لفظوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے موقع پاتے ہی لفظ بھی اُن کے ساتھ اُسی سلوک کے مرتکب ہوجاتے ہیں مثلاً ایک صاحب کہیں لکھ گئے: ''یہ تحریر میرے سفر نامے کی رُوداد ہے''۔ ہوسکتا ہے کہ عام قاری کی نگاہ اس جملے کے جھول کو نہ سمجھ پائے مگر میرا خیال ہے کہ توجہ کی جائے تو 'تحریر'، 'نامہ' اور 'رُوداد' کی یکجائی واضح ہو جائے گی۔[۴] زیادہ رنگین ترکیبوں اور فالتو لفظوں سے پرہیز ضروری ہے مثلاً جہاں کہیں 'صحت و عافیت' اور 'امن و امان' وغیرہ نوعیت کی ترکیبیں ملیں تو یہ ضرور غور کرنا چاہیے کہ کیا یہاں دونوں لفظوں کی ضرورت ہے یا ایک ہی کافی ہوگا مثلاً امن سے مراد فساد کا نہ

ہونا اور امان سے مراد کسی کی پناہ میں ہونا ہے۔ اگر کوئی ایسی صورتِ حال ہے جس کے لیے دونوں لفظ درکار ہیں تو بخوشی امن و امان کہیے ورنہ ایک ہی لفظ کافی ہے۔ یہی حال صحت و عافیت کا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ صحت ہو لیکن عافیت نہ ہو۔ یا عافیت ہو اور صحت نہ ہو۔ پھر کیوں نہ ہم وہی کہیں جو فی الحقیقت مراد ہے۔[۵] عوام اپنے بول چال میں غلطی کر جائیں تو ہمیں اُن سے کچھ نہیں کہنا مگر خواص کے ہاں جب یہ بے احتیاطی نظر آتی ہے تو ہم جیسے مُبتدی بہت کُڑھتے ہیں کہ یہی لوگ تو زبان و بیان کا معیار بنتے ہیں اور اِسی عمل سے اُن کا وقار قائم ہوتا ہے۔ لفظ کے محلِّ استعمال کی غلطی کی مثال ملاحظہ کیجیے: ''لاہور کسی زمانے میں شاعروں کی آماج گاہ تھا''۔ دوسری مثال دیکھیے: ''لاہور کے گنجان علاقوں میں گٹر (Gutter) کیڑے مکوڑوں کا مسکن ہیں۔'' اِن جملوں میں جہاں آماج گاہ لکھنا چاہیے تھا وہاں مسکن لکھا گیا اور جہاں مسکن کا محل تھا وہاں آماج گاہ لکھ دیا گیا۔ کون نہیں جانتا کہ ''آماج گاہ'' منفی معنوں ہی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

الفاظ کو غلط اور بے جا استعمال کرنے کا شوق رکھنے والے کبھی کبھی صرف غلط اِملا کا سہارا لے کر دل کی تسلی کر لیتے ہیں۔ ''دونوں'' لکھنے کے بجائے ''دونو'' لکھتے ہیں لیکن اس لفظ میں نونِ غُنّہ غائب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تینوں'' اور ''چاروں'' کو ''تینو'' اور ''چارو'' لکھنا۔ یہ حضرات پروا کو پرواہ اور بے پروائی کو بے پرواہی لکھ کر دو زبانوں یعنی اردو اور فارسی پر ستم توڑنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ اُردو میں فارسی سے آیا ہے۔ درست لفظ ''پروا'' ہے۔ عوام ہی نہیں غیر محتاط خواص بھی اسے ''پرواہ'' بولتے اور لکھتے ہیں حالاں کہ یہ لفظ چاہ، واہ اور راہ کا قافیہ نہیں بن سکتا۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ جو زائد ''ہ'' وہ پروا میں جمع کرتے ہیں وہ بلا تکلف ''قہقہہ'' سے منہا کر کے ''قہقہ'' بنا کر غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ بڑی ڈھٹائی سے تقاضا کو تقاضہ، معمّا کو معمّہ، حیرانی کو حیرانگی، درستی کو درستگی، مع کو معہ اور موقع کو موقعہ لکھ جاتے ہیں۔ اِزدِحام، جس کا مادہ

زحمت، مُزاحمت اور مُزاحم وغیرہ سے ہے اُسے اژدہام لکھتے ہوئے نہیں شرماتے۔ غضب سے متاثر ہو کر قرآنی لفظ غیظ کو ''غیض'' لکھتے ہیں۔ ایسے ادیب ''مرتبے پر فائز نہیں ہوتے'' فائض ہوتے ہیں۔

ہندی، فارسی، انگریزی اور دیگر غیر عربی الفاظ کو بزعم خویش عربی لبادہ پہنا کر اُردو میں مروج کرنا محض لفظی بازی گری ہے مثلاً انگریزی لفظ بور(Bore) سے ''بوریت''۔ کسی نے پہلے پہل لفظ ''بوریت'' کی اختراع کی تو غیر محتاط اور ناواقف لوگوں نے اس کا استعمال شروع کر دیا۔ غیر عربی الفاظ پر تنوین کا استعمال مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے مثلاً تخمیناً یا تقریباً کے بجائے اندازاً کہنا اور لکھنا اس قسم کی غلط پسندی یا بے خبری کا ثبوت ہے۔ تنوین عربی صَرف کا ایک قاعدہ ہے جسے ہم اسم(noun) کو adverbial صورت دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں یعنی اسم (noun) کے ساتھ ''ن'' کی آواز بڑھا دیتے ہیں اور اس کے لکھنے کی صورت تقریب سے تقریباً اور تخمین سے تخمیناً ہوتی ہے جس کا معنی ہے ''کسی خاص صورتِ حال کے قریب قریب'' یا ''اندازے سے''۔ اندازہ ایک فارسی لفظ ہے اور فارسی لفظوں پر تنوین کا عمل نہیں ہوتا۔[٦] اندازاً کہنا نہایت مضحکہ خیز بات ہے مگر اردو بولنے والوں میں آپ کو بہت سے لوگ مل جائیں گے جو تقریباً یا تخمیناً کے بجائے اندازاً کہتے ہیں۔

اُردو زبان کے مقابل ایک ''متوازی اُردو'' بڑی تیزی سے پنپ رہی ہے۔ خودغرضی اور نفسا نفسی کے اس دور میں، اس طوفانِ بدتمیزی سے نمٹنے کے لیے، کسی کو فکر ہے اور نہ پروا۔ خاکم بدہن بہت بڑا خطرہ دکھائی دے رہا ہے کہ کہیں متوازی اُردو اصل اُردو کی جگہ نہ لے لے۔ ایک دور تھا کہ ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی وژن اور قومی اخبارات و جرائد اصلاحِ زبان و ادب کا مؤثر ذریعہ ہوا کرتے تھے۔ اِن اداروں کا کردار جامعات وکلیات سے کم نہیں ہوتا تھا، افسوس کہ آج یہ ادارے اپنا لسانی تشخص کھو بیٹھے ہیں۔ ٹیلی وژن پر بیٹھے اینکر پرسن اور میزبان بسا اوقات تلفظ کی غلطیوں کے

مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ایک ذمہ دار آفیسر سے راقم نے اس صورتِ حال کا گلہ کیا تو انھوں نے برملا کہا کہ عوام کی ضرورت خبر کا ابلاغ ہے نہ کہ صحتِ الفاظ، ہماری ترجیح محض خبر کا ابلاغ ہے۔[۷] ٹیلی وژن چینلز نے سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ اُصول اور فارمیٹ اپنا لیا ہے کہ 'میم' سے شروع ہونے والے وہ الفاظ جن کے پہلے حرف پر پیش آتی ہو اُسے خواہ مخواہ زبر کے ساتھ پڑھا اور لکھا جائے مثلاً مُثبت کو مَثبت، مُختص کو مَختص، مُنتقِم مزاج کو مَنتقِم مزاج، مُنتقِل کو مَنتقِل، مُنہدِم کو مَنہدِم، مُنتخِب کو مَنتخِب اور مُنقطع کو مَنقطِع وغیرہ۔ ایسا کرنے اور سوچنے والے زبان کے معاملے میں قطعی طور پر جاہل ہیں۔ مُثبت کو مَثبت کہنے والے ایک حضرت کو ٹوکا تو کمالِ استدلال سے کہنے لگے اچھا یہ بتاؤ پھر مَنفی کو مُنفی کیوں نہیں کہتے؟

لفظ ''عظیم'' کی عظمت، حُسن اور معنویت کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ اُردو زبان و ادب میں یہ ہمیشہ مُثبت معنوں میں آیا ہے۔ اِبلاغ اور نشر و اشاعت میں آج کل 'عظیم آتش زدگی'، 'عظیم المیہ' اور 'جنگِ عظیم' جیسی تراکیب ہماری سماعتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں اور ہماری نظریں بھی اِن الفاظ پر پڑتی رہتی ہیں۔ اہلِ ادب پر عجیب سی بے حِسی چھائی ہوئی ہے کہ کسی نے بھی توجہ نہیں دلائی کہ ''بدترین آتش زدگی''، ''بدترین المیہ'' اور ''جنگِ بدترین'' کہنے میں کیا مضائقہ ہے؟

لفظ ''خوب صورت'' کو لے لیں، اس من بھاؤ نے لفظ میں شکل، چہرے اور نقش کا تصور سامنے آتا ہے۔ اگر کوئی کہے: ''غالبؔ کی غزل کتنی خوب صورت ہے'' تو مقامِ غور ہے۔ ''غالبؔ کی غزل کتنی خوب ہے'' کہنے سے حشو و زوائد سے بچا جا سکتا ہے اور جملے کا حسن اور معنویت بھی سوا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح ''بِھیڑ جمع ہو گئی''، ''مجمع اکٹھا ہو گیا'' بھی حشو و زوائد کی بدترین غلطیاں ہیں۔ ''بِھیڑ ہو گئی''، 'مجمع ہو گیا' ہی کافی ہے۔ 'زبر' اور 'زیر' کے معنی بتدریج 'اوپر' اور 'نیچے' ہیں اور 'دست' کے معنی ہاتھ ہیں۔ لفظ 'زبردست' کے معنی ہوئے اوپر والا ہاتھ یعنی طاقت ور اور غالب۔ 'زیر دست' کے معنی

ہیں نیچے والا ہاتھ یعنی مغلوب، کمزور اور عاجز۔ لیکن ''زبردست'' کا یہ استعمال کیا صحیح ہے کہ: ''کل صبح زبردست بارش ہوئی'' اور ''مہدی حسن کی آواز بڑی زبردست ہے''۔

''کافی'' کا معنی 'کفایت کرنے والا' ہے[۸] جبکہ اُردو میں اس کا استعمال 'حسبِ ضرورت' کے معنوں میں ہوتا ہے۔اکثر لکھنے والے ''کافی'' کے اصل مفہوم، معنویت اور محلِ استعمال کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے غیر محتاط ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ نہ جانے کیوں اُن کے ذہن میں اس لفظ کا معنی 'بہت' یا 'بہت زیادہ' سمایا ہوا ہے حالاں کہ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں ہے۔ ''اُسے بہت تشویش ہوئی'' کے بجائے ''اُسے کافی تشویش ہوئی'' کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ اب تشویش کی کسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس مصیبت کے کافی ہونے کی تمنّا کرے۔ لفظ ''آخری'' کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ شاید مرنے سے پہلے زندگی کا کوئی آخری کام کیا ہے۔ ''میرا آخری خط تمھیں مل گیا ہوگا'' سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مزید خط لکھنے کا موقع نہیں ملے گا، حالاں کہ درست اس طرح ہے: ''میرا گزشتہ خط تمھیں مل گیا ہوگا''۔ ہم اکثر بولتے ہیں: ''وہ لاہور کے لیے روانہ ہوگیا'' اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ لاہور نے اس کے آنے کی خواہش کی ہے۔ جُملہ سیدھا، کم خرچ اور درست یُوں ہے: ''وہ لاہور روانہ ہوگیا۔''، ''اُمید'' کا بے جا استعمال کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: ''اُمید ہے کہ وہ لاہور جائے گا۔'' حالاں کہ یہاں اُمید کے بجائے 'خیال' کا محلِ استعمال ہے اور درست جملہ یوں ہوگا: ''خیال ہے کہ وہ لاہور جائے گا''۔ کھانا (To eat) کے بجائے کوئی چیز ''لینا'' یعنی To take one egg انگریزی زبان میں تو روا ہے مگر اُردو میں اگر کوئی کہے: ''میں ناشتے میں صرف ایک انڈہ لیتا ہوں'' تو اِسے غلط تصور کیا جائے گا۔ درست جملہ اس طرح ہوگا: ''میں ناشتے میں صرف ایک انڈہ کھاتا ہوں''۔ اِسی طرح تجویز رکھی نہیں جاتی، پیش کی جاتی ہے مثلاً ''فلاں صاحب کے سامنے تجویز رکھی گئی'' کی نسبت ''تجویز پیش کی گئی'' صحیح ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے لکھنے والے ایسے بھی

ہیں جو لفظوں کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں مثلاً ایک لفظ 'فرد' ہے جس کی جمع ہے افراد اور ایک لفظ ہے 'لوگ'۔ لوگ اور فرد کے معنوں پر نگاہ مرکوز رکھیں۔ آپ نے اخبارات میں پڑھا اور ٹیلی وژن پر سنا ہو گا کہ: ''کار حادثے میں پانچ لوگ ہلاک ہو گئے'' جب کہ یہاں افراد کا محل ہے لوگ کی جگہ 'افراد' لکھا اور کہا جانا چاہیے۔

لفظوں کے صَرف کے بارے میں ہمیں ہر وقت چوکنّا رہنا چاہیے۔ روز مرّہ اور محاورے کا لحاظ اور پابندی بہت ضروری ہے ورنہ یوں معلوم ہو گا جیسے ہم کوئی بے معنی بات کر رہے ہیں۔ لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ الفاظِ مترادف میں فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ خون اور لہو دونوں اُردو میں اگرچہ ہم معنی ہیں لیکن محاوروں میں ایک دوسرے کی جگہ نہیں لے سکتے۔ اُردو میں خون پر مبنی محاورے کوئی دو درجن سے زائد ہیں، لہو پر مشتمل محاورات کی تعداد بھی کم نہیں۔ خون کی جگہ لہو اور لہو کے بجائے خون کا استعمال درست نہیں ہو گا مثلاً ''فلاں شخص کئی خون کر چکا ہے'' کی جگہ ''فلاں شخص کئی لہو کر چکا ہے'' درست نہیں ہو گا یا مثلاً ''میری اُمیدوں کا خون ہو گیا'' کے بجائے ''میری امیدوں کا لہو گیا'' غلط ہو گا۔ ایک محاورہ ہے ''ہاتھوں کے طوطے اُڑنا'' جس کا معنی ہے 'حواس باختہ' ہو جانا۔ کچھ لوگ بغیر سوچے سمجھے کہہ دیتے ہیں: ''اُس کے ہاتھ پاؤں کے طوطے اُڑ گئے......'' محاورے میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں ہے، طوطے ہاتھوں کے ہوتے ہیں پاؤں کے نہیں اور پھر صرف ہاتھوں کے ہوتے ہیں ہاتھ کے نہیں۔ 'حادثہ' اور 'سانحہ' بظاہر ہم معنیٰ ہیں اور عام طور پر ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہو جاتے ہیں مگر اِن دونوں میں ایک لطیف فرق اور خفیف بُعد ایسا ہے جسے لسان شناس ادیب اور شاعر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ عنایت علی خان کا یہ مشہور شعر اس کی زندہ مثال بن گیا ہے:

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

''اِمالہ'' کے بارے میں ادیبوں اورشاعروں کی ایک تعداد غلطی کر جاتی ہے۔''اس سلسلہ میں''، ''اس مسئلہ میں''، ''اس بارہ میں'' اور ''اس موقعہ پر'' وغیرہ لکھتے اور بولتے ہیں جب کہ ''اس سلسلے میں''، ''اس مسئلے میں''، ''اس بارے میں'' اور ''اس موقعے پر'' لکھنا اور بولنا چاہیے۔ اِمالے کے سلسلے میں جوشؔ ملیح آبادی کا ایک سبق یاد آ گیا، مخاطب تھے ممتاز جدید شاعر و ادیب احمد ہمیش جو مطلع اور مطلعے پر جوشؔ سے بحث پر آمادہ تھے اور اِمالے سے ناواقفی کے سبب اڑے ہوئے تھے۔ جوشؔ نے تنگ آ کر کہا کہ میاں! مثلاً آپ کے دادا جان کو گُھڑ سواری کا شوق تھا اور ایک دن اس شوق نے اُن کی جان لے لی تو آپ یہ کہیں گے کہ میرے دادا 'گھوڑا' سے گر کر مر گئے یا کہ میرے دادا گھوڑے سے گر کر مر گئے؟ اخبارات و رسائل اور ٹیلی وژن پر اِمالہ کا غلط استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ اکثر ایسے جُملے پڑھنے اور سننے کو ملتے ہیں: ''مشاعرہ کی شام کو بارش ہونے لگی''، ''مسلم لیگ کے جلسہ میں پانی چھوڑ دیا گیا''، ''مدرسہ کا دروازہ ٹوٹ گیا''، ''جہانگیر کے مقبرہ کو دُور سے دیکھا'' اور ''کلکتہ سے شملہ تک'' وغیرہ۔ جب کہ ان کا درست استعمال اس طرح ہے: ''مشاعرے کی شام کو......''، ''مسلم لیگ کے جلسے میں......''، ''مدرسے کا دروازہ......''، ''جہانگیر کے مقبرے کو......'' اور ''کلکتے سے شملے تک'' وغیرہ۔

اِس کے برعکس کچھ حضرات اِمالہ کے دیوانے ہوتے ہیں۔ ایک صاحب نے اِسی محبت میں کہہ ڈالا: ''میں مدینے منورے جا رہا ہوں'۔ یہاں مدینہ کی صفت منورہ کا اِمالہ منورے کی صورت میں کسی طور پر جائز نہیں ہے۔''مدینہ منورہ جا رہا ہوں'' یا ''میں مدینے جا رہا ہوں'' درست ہوگا۔

بعض لوگوں کو بغیر کسی قرینے کے ''بھی'' کثرت سے لکھنے اور بولنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً ''ترجمہ نگاری فن بھی ہے، ذوق بھی اور لیاقت بھی''۔ قاعدہ یہ ہے کہ جملے میں اُجاگر کی جانے والی تین خاصیتوں میں سے پہلی خاصیت کے ساتھ 'بھی' نہیں

آ تا۔ درست اس طرح ہو گا: ''ترجمہ نگاری فن ہے ذوق بھی اور لیاقت بھی''۔ اِسی طرح ''باوجوذ'' کے بعد 'بھی' کا استعمال راقم کے نزدیک مکروہِ تحریمی کا درجہ رکھتا ہے۔ 'باوجوذ' میں 'بھی' کا مفہوم آ جاتا ہے لہٰذا ''اس کے باوجود بھی'' کہنا غلط ہے اور ''اس کے باوجوذ'' لکھنا اور بولنا درست ہے۔ بعض لوگ الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے قاعدے کو نہ سمجھتے ہوئے بول چال میں کہہ دیتے ہیں: ''میرا خیال بھی رکھیں''۔ یہاں 'بھی' کے محلِّ استعمال میں غلطی ہوگئی۔ 'بھی' خیال سے مقدم ہے اور صحیح جملہ یوں ہو گا: ''میرا بھی خیال رکھیں۔'' اِسی طرح کہہ جاتے ہیں: ''میری عدالت سے درخواست ہے۔'' اس جملے میں ''عدالت سے''، ''میری'' سے مقدم ہے اور صحیح جملہ اس طرح ہو گا ''عدالت سے میری درخواست ہے''۔

ناظمِ مشاعرہ نے کسی شاعر کو مدعو کرتے ہوئے کہا: ''اب میں گزارش کرنے جارہا ہوں فلاں شاعر سے کہ وہ سٹیج پر تشریف لائیں اور......''۔ ناظمِ مشاعرہ کی اس دعوت سے بھرپور تاثر مل رہا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر گزارش کرنے جارہے ہیں۔ اس تکلف سے بچنے کے لیے انھیں کہنا چاہیے تھا: ''اب میں گزارش کرتا ہوں'' یا ''کررہا ہوں''۔ ہم بات بات پہ کہتے ہیں: ''حیرانی کی بات ہے''۔ ذرا سا غور کرنے سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ: ''حیران کن بات ہے'' زیادہ فصیح ہے۔ ٹیلی وژن کے ایک ڈرامے کا یہ مکالمہ اُردو کے زوال کا اعلان کررہا ہے: ''آپ کو اپنے اوپر مفکر ہونے کا شبہ ہوگیا ہے''۔ اس مکالمے میں ''اپنے اوپر'' کا نہیں ''اپنے آپ'' کا محل ہے یعنی ''آپ کو اپنے آپ پر مفکر ہونے کا شبہ ہوگیا ہے''۔ ''دِن بدن'' کی ترکیب سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ یہ قاعدہ تو واضح ہے کہ کسی ہندی لفظ کے ساتھ ''بہ'' لگا کر ترکیب بنانا اور استعمال کرنا اصول وقواعد کے خلاف ہے۔ اس کے مقابل ''روز بروز'' صحیح اور آسان ترکیب ہے۔ ایک ہندوستانی ٹیلی وژن چینل سے یہ جملہ سُنا گیا: ''فلاں ادیب نے ایوارڈ لینے سے منع کر دیا''۔ کہنے والے کا مدعا یہ تھا کہ ''ایوارڈ لینے

سے انکار کر دیا''۔ ''منع کرنا'' کا معنی ہے روکنا، یہ ''انکار کرنا'' کے معنی میں قطعاً نہیں آ سکتا۔

اُردو تہذیب کا دستور ہے کہ اپنے گھر کے لیے ''غریب خانہ'' اور دوسرے کے گھر کے لیے ''دولت خانہ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ''کیا میں آپ کے 'غریب خانے' پر تشریف لا سکتا ہوں تو زبان دانوں کے لیے یہ ایک لطیفہ بن جائے گا۔ اسی طرح دوسرے کی آمد پر ''تشریف لائیے'' اور اپنے لیے ''میں حاضر ہوا'' کہا جاتا ہے۔ ''تشریف لانا'' اور ''حاضر ہونا'' میں آمد ہی کے معنی ہیں مگر محل استعمال اور زبان کی تہذیب کا فرق ہے۔ کسی مہمان کی آمد پر ''تشریف لائیے'' آپ نے سنا ہی نہیں بلکہ بولتے بھی ہوں گے لیکن کسی کو اپنے لیے یہ کہتے نہیں سنا ہو گا کہ ''میں تشریف لایا تھا تو آپ غیرِ حاضر تھے'' اور اگر کوئی اس طرح کہہ بیٹھے تو لوگ مسکرا دیں گے کہ یہ زبان نہیں جانتا۔ [۹]

بعض ادیب اور کالم نویس بے خبری یا کم علمی کی وجہ سے ''ھ'' اور ''ہ'' میں فرق روا نہیں رکھتے اور اِن دونوں حرفوں کو الفاظ میں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اس جملے پر غور کیجیے: ''شیر دہاڑتا ہوا جنگل سے نکلا''۔ اِسے بعض لوگ ''شیر دھاڑتا ہوا'' کہتے ہیں یعنی ''دہاڑ'' کو دو چشمی ھ سے ''دھاڑ'' لکھ دیتے ہیں۔ یاد رہنا چاہیے کہ شیر کی ''دہاڑ'' اور چیز ہے اور لُچوں لفنگوں کی مار دھاڑ اور چیز۔ ''مشکور'' کا شکر گزار کے معنی میں استعمال تو عام ہو چکا ہے۔ خدا نہ کرے کہ اُردو زبان پر ایسا وقت آئے کہ لوگ ''مقتول'' کو قاتل کے معنی میں استعمال کرنے لگیں۔ گزرے زمانوں میں بھلے لوگ سراپا ''اِنکسار'' ہوتے تھے اب یہ زمانہ بھی دیکھنا پڑ رہا ہے کہ آج کل سراپا ''انکساری'' ہیں۔ رمضان المبارک میں روزہ دار بڑے اشتیاق سے ''اِفطار'' کا اہتمام کیا کرتے تھے مگر اب اِفطار سکڑ کر ''افطاری'' بن چکا ہے۔

اِرتکازِ توجہ کے نہ ہونے کی وجہ سے، بسا اوقات سماعت کے مغالطے اور

نظر و ذہن کے عدمِ ارتباط کے سبب الفاظ کچھ سے کچھ بنا دیئے جاتے ہیں۔ سنتے، بولتے اور لکھتے وقت اپنے ذہن کو حاضر نہ رکھنا بھی غلطی کے زمرے میں آتا ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر نے خبر بنائی: ''نقضِ امن کے پیشِ نظر حکام نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی''۔ کاتب کی عجلت نے ''نقض'' کا ایک نقطہ ہضم کر لیا۔ چھپنے کی بعد بھی اس غلطی پر کسی کی نظر نہیں گئی اور ''نقضِ امن'' کے بجائے ''نقصِ امن'' ہی رائج ہو گیا۔ ''نقض'' کے معنی توڑنے کے ہیں، نقضِ امن یعنی امن توڑنا جبکہ ''نقص'' کے معنی عیب کے ہیں اب ذرا سوچیے کہ ''امن کا عیب'' چہ معنٰی؟[۱۰]

ٹیلی وژن اینکرز اور کالم نگار حضرات تکرارِ لفظی و معنوی کے ایسے ایسے شگوفے چھوڑتے ہیں کہ سر پیٹنے کے جی چاہتا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ کیجیے جن کا استعمال تحریر و تقریر میں کثرت سے کیا جاتا ہے۔ ''اِس میں یہ راز پوشیدہ ہے''، ''بار بار اعادہ کرنا''، ''بدبُو سے تعفن پھیلنا''، ''پُر کٹھن حالات میں''، ''پہلے سے پیش بندی''، ''تاثر کے زیرِ اثر''، ''تحریری مقالہ رقم کرنا''، ''تقریباً دس کے قریب''، ''تمام جملہ امراض''، ''تمام فریقین''، ''خرچ کرنے کا صحیح مصرف''، ''دیکھنے میں دیدہ زیب''، ''شعری مجموعۂ کلام''، ''عیاں دکھائی دیتا ہے''، ''کام میں مصروفِ عمل''، ''کوئی ایک فردِ واحد''، ''پانچ مقتولوں کو قتل کر دیا گیا''، ''نئی جدّت''، ''یومِ عاشور کا دن'' اور ''یہ نوشتۂ دیوار پر لکھا ہوا ہے''۔

باقر مہدی کا شعر ہے:

ذرا سنبھال کے لفظوں کو جوڑیے صاحب!
کہ اس مکان میں ایک عمر تک رہے گا کوئی

واضح رہے کہ ''کوئی'' دوسرا نہیں بلکہ لفظوں کے مکان میں لکھنے والے ہی معنی بن کر قیام کرتے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، ناسخؔ، آتشؔ، داغؔ اور اقبالؔ جیسے شاعر اِنھی مکانات میں سالوں سے مقیم ہیں بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ و معنی کے تعلق سے

یہ لوگ مینارۂ نور بن گئے ہیں۔[۱۱] طوالتِ بیان، لفظی بے راہ روی اور تکلّفات اِسرافِ لفظی ہی کی صورتیں ہیں۔ اُردو کی توقیر اور اس کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک مستقل عزم کے ساتھ اِن عیبوں کو ترک کرنا ہو گا۔ نوجوان طلبہ کی تربیت کرتے ہوئے اُن میں لفظوں کو پرکھنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہو گی۔ اُن میں ذوق وشوق اور غور وفکر کی خُو پیدا کرنی ہو گی کہ لفظوں کو پرکھنے، صحت سے ادا کرنے اور صحیح جملے بنانے کی عادت ابھی سے ڈال لیں۔

ہم فالتو لفظوں کی جھوٹی چمک سے مات کھا چکے ہیں۔ کھوکھلی ترکیبیں، اصل معنی کو گھسیٹ کر یوں اِدھر اُدھر لے جانے لگیں ہیں کہ ہمارا کہا اُن کا کہا برابر ہو گیا ہے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ تحریر میں لفظ کم اور معنی زیادہ ہوں۔ اِسی کو بلاغت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لفظوں کا صحیح استعمال قومی زبان سے محبت کا ثبوت اور ہماری ترقی کی ضمانت ہے۔ قومی زبان سے بے نیاز ہو کر قومیں زندہ نہیں رہ سکتیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ندیم صدیقی، پُرسہ، (ممبرا۔ تھانے (انڈیا): اُردو قبیلہ، دسمبر ۲۰۱۵ء)،ص ۲۷۰۔

۲۔ پروفیسر حمید احمد خان، تعلیم وتہذیب، (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۲۰۰۶ء)،ص ۱۹۱

۳۔ ......ایضاً......،ص ۲۰۰

۴۔ پروفیسر غازی علم الدین، تخلیقی زاویے، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۷ء)،ص ۹۷

۵۔ تعلیم وتہذیب،ص ۲۰۱

۶۔ ......ایضاً......،ص ۱۹۶

۷۔ پروفیسر غازی علم الدین، لسانی مطالعے، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء)،ص ۱۵۹

۸۔ عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات، (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ۱۹۸۲ء)،ص ۶۴۶

۹۔ پُرسہ،ص ۲۷۳

۱۰۔ ......ایضاً......،ص ۲۶۶

۱۱۔ ......ایضاً......، ۲۷۶

نفاذِ اُردو کی راہ میں دو رُکاوٹیں......

انگریزی کا تسلُط اور لسانی تعصُب

(''اُردو: ماضی، حال اور مستقبل'' کے تناظر میں)

اِس عالمی اُردو کانفرنس کا موضوع ...... اردو: ماضی، حال اور مستقبل، ہر زندہ ضمیر پاکستانی کے دل کی آواز ہے۔ ماضی میں کیا کھویا، حال میں کیا غلطیاں ہو رہی ہیں اور مستقبل میں اردو کی کیا صورت ہو گی؟ یہ سوچ کر ہر محبّ وطن پاکستانی کا دل رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اُردو، جو برصغیر میں اسلامی تہذیب کی نمائندہ زبان اورتحریکِ پاکستان کا ایک توانا محرک ہے آج اپنے ہی وطن میں بے وقعتی، ناقدری اور زوال کا شکار ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود ہم اپنی قومی زبان سے بے اِعتنائی برت رہے ہیں، گویا ہم نے ابھی تک ذہنی غلامی کا طوق اپنے گلے سے نہیں اُتارا ہے۔ میری باسٹھ سالہ زندگی کا تجربہ ہے کہ انگریزی پر غیر ضروری انحصار بے تدبیری ہے اور خواہ مخواہ کی مشکل پسندی بھی۔ وہ انگریزی زبان جو سات عشروں سے ہمارے ہاں پڑھائی جا رہی ہے، ابھی تک اِس میں ہماری قومی زندگی کی حرکت شامِل نہیں ہو سکی ہے۔اپنے تعلیمی نظام میں انگریزی کے تسلط کو تسلیم کرکے، ہم سات عشرے اور کئی نسلیں تباہ کر چکے ہیں۔ اُردو کے عدمِ نفاذ کی بدولت نہ تو ملک ترقی کی راہ پر گامزن

ہو سکا، نہ قومی اِتحاد پیدا ہوا اور نہ ہم سیاسی اِستحکام سے ہم کنار ہو سکے ہیں۔حضرت قائداعظمؒ کے فرمان اور فیصلے کو نظر انداز کرکے انگریزی کو ہمہ گیر فوقیت دے دی گئی ہے۔ملکی آبادی کی ایک فیصد اشرافیہ اور نوکر شاہی، ننانوے فیصد آبادی کا استحصال کررہی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری نسلیں اِحساسِ کمتری کا شکار ہوگئیں۔اپنی قومی زبان اردو کی نسبت یہ احساس اور گمان پیدا کیا جاتا رہا کہ وہ ایک کم مایہ، بے بضاعت اور بے وقعت زبان ہے جو حال اور مستقبل میں ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔اتنا نقصان ہونے کے باوجود اب بھی انگریزی کو مکمل طور پر ذریعۂ تعلیم بنانے کے لیے آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔میں یہ بات پوچھنے میں حق بجانب ہوں کہ ہم پر ایک ایسی زبان کیوں مسلط کی جارہی ہے جو ہماری تہذیب اور تمدّن سے کوئی عِلاقہ نہیں رکھتی۔یہ اقدام قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ایک منظّم سازش ہے۔خدارا! اِس بات کا اِدراک کر لیجیے کہ انگریزی کے تسلط نے ہماری نوجوان نسل کے ذہنی تموُّج کو روک دیا ہے۔ اس حقیقت کو کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا کہ تخلیقی فکر کا چشمہ ہمیشہ اندر سے اُبلتا ہے...... پرائی زبان میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے قوم کے مُنہ میں زبان نہیں آتی، گونگی بن جاتی ہے۔

یہ اشرافیہ ہی کا پھیلایا ہوا مذموم خیال ہے کہ اردو کا کام صِرف تخلیقِ شعر و ادب ہے، جدید سائنس کے لیے اُردو کا ذریعۂ تعلیم ہونا ناممکن ہے اور یہ کہ سائنس صرف انگریزی سے سیکھی جاسکتی ہے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سائنسی فکر کا ظہور اور فروغ، اُردو کو ذریعۂ اظہار بنائے بغیر ممکن نہیں ہے۔تعلیم کا پورا عمل، زبان کے سہارے سرانجام پاتا ہے جس سے سائنس آزاد ہے اور نہ ادب۔ اردو،اتنی ثروت مند زبان ہے کہ اپنی نثر میں سائنسی مضامین کے لیے، مبالغے اور غیر ضروری لفظی آرائشوں سے پاک ایک مُناسِب اُسلوبِ بیان وضع کرسکتی ہے۔

پاکستانی زبانوں کے تعلق سے ایک اہم بات کہنا چاہوں گا کہ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور دیگر پاکستانی زبانیں،اُردو کی طرح ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔آٹے میں نمک کے برابر، کچھ شر پسند عناصِر، زبانوں کو اپنی عصبیت کی بھینٹ چڑھا کر، وطنِ عزیز کا امن خراب کرنے کی کوشش کرر ہے ہیں۔ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اُردو کی دیگر پاکستانی زبانوں سے کوئی مخاصمت اور دوری نہیں ہے بلکہ یہ سب ایک ہی تہذیبی روایت کی زبانیں ہیں۔ پاکستان کی یہ علمی و ادبی روایت شِمال سے لے کر جنوب تک ایک ہی ہے۔ میں اربابِ بست و کُشاد سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ ایسے شر پسند عناصِر کو روکیں جو اردو کے خلاف نفرت پھیلا کر مُلک کا امن اور سُکون برباد کرر ہے ہیں۔

میں بڑے اِحترام سے، اُردو دشمنی پر مبنی ایک خطرناک بات کی طرف آپ سب کی توجّہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ہمارے نشریاتی ذرائع اِبلاغ خصوصاً ریڈیو اور ٹیلی وژن، فروغِ اُردو کے ضمن میں اپنا منصب بھول چکے ہیں۔ یہ اُردو زبان کے خوبصورت چہرے کو مسخ کرنے کی ایک منظّم سازش ہے۔ درجنوں ٹی وی چینل جو ماہانہ اربوں روپے کماتے ہیں، اُردو زبان کے بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔تلفُّظ کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں۔ میری تجویز ہے کہ انھیں قانون اور ضابطے کے دائرے میں لایا جائے اور پابند کیا جائے کہ زبان و بیان اور تلفُّظ کی درستی کے سلسلے میں اُردو کے ماہراساتذہ کی خدمات حاصل کریں۔

میرا بھرپور مطالبہ ہے کہ آئینِ پاکستان اور عدالتِ عظمٰی کے ۲۰۱۵ء کے فیصلے کی روشنی میں، اُردو کو فی الفور نافذ کیا جائے۔ پاکستان کی مسلّح افواج، حکومتی و سرکاری اور نجی اداروں، محکموں، عدلیہ اور مُقنّنہ میں بھی تمام تر سرکاری اور دفتری اُمور و مُعاملات قومی زبان اردو میں سرانجام دیے جائیں۔ اندرونِ ملک خط کتابت، مُراسَلت ،عدالتی کارروائی اور فیصلے، سب کچھ اردو زبان میں کرنا لازِمی قرار دیا جائے۔

اگر اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے دیا جائے تو نہ صرف انگریزی کا غیر ضروری دخل جاتا رہے گا بلکہ خالص علمی اعتبار سے درس و تدریس کا معیار بلند ہو جائے گا۔ اس سے ہماری نسلوں میں اعتماد پیدا ہو گا، عوامی شعور فروغ پائے گا، جمہوری سوچ پروان چڑھے گی اور مثبت رویّے تشکیل پائیں گے۔

اُردو، قومی ہم آہنگی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور یہ کردار مستقبل میں بھی ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے صوبوں کے درمیان ہم جہتی کی بنیاد قومی زبان اُردو کا مُشترک ہونا ہے اور یہ اِشتراک نعمتِ خداوندی ہے۔ یک زبانی قوم کی وحدت و سالمِیّت کے استحکام کا باعث بنتی ہے۔ قوموں کی بقا ایک ملک اور ایک قومی زبان کا تقاضا کرتی ہے۔ سیاسی آزادی...... ذہنی آزادی کے بغیر بے کار ہے اور ذہنی آزادی کے پھول صرف قومی زبان کے باغ میں کھلتے ہیں۔ اردو، ہماری قومی زبان ہے جس کے بغیر ایک ملک اور ایک قوم کا دعویٰ مُہمَل سا معلوم ہوتا ہے۔

اقبال اور اُردو

(دوروزہ عالمی اقبال کانفرنس کے تعلق سے)

یہ، دو روزہ عالمی اقبال کانفرنس، دراصل اہلِ حلّ و عقد، ادیبوں، شاعروں اور جامعات وکلیات کے استادوں کو دعوت دے رہی ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کا جائزہ لیں کہ اقبال اور اُردو کے تعلق سے اپنی اپنی ذمہ داری کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کانفرنس نتیجہ خیز ثابت ہوگی اور ہم اقبال کی بصیرت، اُردو سے اُن کے گہرے اخلاص اور نفاذِ اُردو کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

آج اُردو زبان ہر طرف سے زخم کھا رہی ہے اور کوئی چارہ گر نہیں۔ آزادی حاصل کرنے کے باوجود ہم اپنی قومی زبان سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ انگریزی پر غیر ضروری انحصار سے اٹھانوے فیصد عوام میں مایوسی اور احساسِ کمتری زور پکڑ رہی ہے۔ وہ انگریزی زبان، جو سات عشروں سے ہم پر مسلّط ہے، ابھی تک اِس میں ہماری قومی زندگی کا تحرّک شامل نہیں ہو سکا ہے۔ اُردو کی نسبت یہ احساس اور گمان پیدا کیا جا رہا ہے کہ وہ ایک کم مایہ اور بے وُقعت زبان ہے جو حال اور مستقبل میں ترقی کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ یہ اقدام قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ایک منظّم سازش ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ تخلیقی فکر کا چشمہ ہمیشہ اندر سے اُبلتا ہے۔ پرائی زبان میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے قوم کے منہ میں زبان نہیں آتی، گونگی بن جاتی ہے۔

ایک طرف انگریزی کے تسلط نے ہماری نوجوان نسل کے ذہنی تموّج کو روکا ہوا ہے دوسری طرف کچھ نام نہاد دانش ور اُردو کے خلاف نفرت پھیلا کر پاکستانی زبانوں کو اپنی عصبیت کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ تیسری طرف ہمارے نشریاتی ذرائع ابلاغ فروغِ اُردو کے ضمن میں اپنا فرض اور منصب بھول چکے ہیں۔ زبان دشمن عوامل اتنے زیادہ ہو چکے ہیں کہ مخلص لوگوں کی جاں فشانیوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ذہنوں پر جدید ذرائع ابلاغ کا ساحرانہ اثر اس قدر بڑھ گیا ہے کہ تلفظ اور لغت کے صاف وصریم تقاضوں کا خون ہو رہا ہے اور کوئی پوچھتا نہیں کہ یہ سب کیا اور کیوں ہے۔ سہولت پسندی نے یہ راہ نکالی ہے کہ ہرِ غلطی کو جدّت کا عنوان دے دیا جائے اور زبان سیکھنے کے بجائے زبان ایجاد کرنے کا علَم بلند کیا جائے۔

اُردو زبان کے ساتھ ہم جو کچھ کر چکے ہیں اور جو کر رہے ہیں، اِسے محسوس کر کے عالمِ برزخ میں علامہ اقبال کی رُوح کو تکلیف ضرور پہنچ رہی ہوگی۔ علامہ کی رُوح ہمیں پکار پکار کر استفسار کر رہی ہوگی کہ اُردو کی حیثیت اور نفاذ کے بارے میں حضرت قائداعظم کے فرمان کو پسِ پُشت کیوں ڈالا گیا؟ علامہ اقبال کی بصیرت کو داد دیجیے، اُنھیں اپنی مادری زبان پنجابی سے گہرا شغف اور تعلق تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اُردو کو اپنا ذریعۂ اظہارِ مافی الضمیر بنایا۔ اپنی شاعری کی ابتدا ہی اُردو زبان سے کی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اُردو برِعظیم ہندوستان بھر میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ وہ چاہتے تو شاہ حسین، وارث شاہ، بُلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ غلام فرید، میاں محمد بخش اور پنجابی کے دیگر مشاہیرِ ادب کی طرح اپنی مادری زبان میں بہت قابلِ قدر ادب تخلیق کرتے مگر انھوں نے اُردو زبان کو اس لیے ترجیح دی کہ اہلِ ہندوستان آزادی کی منزل کی طرف گامزن تھے۔ وہ اس حقیقت کا بخوبی ادراک رکھتے تھے کہ اُردو ایک بڑی اور ثروت مند زبان ہے۔ برّعظیم ہندوستان میں انقلاب صرف اردو ہی سے برپا کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہوا تھا اور سمجھتے تھے

کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی علمی اور اصلاحی تحریک سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک، انگریزوں کے تسلط سے لے کر آزادی کی منزل تک، ہر تحریک کی زبان اُردو ہی رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

علامہ اقبال کی نظر اپنے مستقبل قریب کی طرف بھی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ آنے والے عشروں میں اقتصادی اعتبار سے بھی اُردو کی اہمیت دو چند ہو جائے گی۔اس حقیقت کو علامہ اقبال بھی سمجھتے تھے کہ اردو زبان برعظیم پاک و ہند کے عوام کے خمیر میں شامل ہے اور آج بھی یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔اگرچہ اُردو کا نفاذ قومی زبان کے طور پر نہیں ہو سکا ہے جس کا خمیازہ ہماری قوم بھگت رہی ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ مُقنّنہ، عدلیہ، انتظامیہ، عساکرِ پاکستان، سروس سٹرکچر اور تعلیمی اداروں میں اُردو ہی خون کی طرح رواں دواں ہے۔ اگر آج اِن اداروں سے اُردو کو نکال کر بالائے طاق رکھ دیا جائے تو وطنِ عزیز پاکستان کا سارا نظام ہی ٹھپ ہو جائے۔ علامہ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں، دینِ اسلام کی تفہیم، تعلیم اور تبلیغ کا سب سے مؤثر ذریعہ اُردو ہی ہے اور یہ کہ اس تفہیم کی بابت دینی ادب کا گراں قدر اثاثہ بھی اُردو ہی میں ہے۔

علامہ اقبال اس بدیہی حقیقت سے واقف تھے کہ اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس کی بدولت مختلف خِطّوں، جگہوں اور علاقوں کے لوگوں میں میل ملاپ قائم ہو سکتا ہے اور آپس میں محبت، اتحاد، یک جہتی اور باہم ہمدردی کے اعلیٰ جوہر پیدا ہو سکتے ہیں۔ اُنھیں اِس امر کا احساس تھا کہ اُردو کو فروغ دیئے بغیر ہندوستان کی معاشرتی، سماجی، تعلیمی اور تمدّنی مشکلات حل نہیں ہوسکتیں۔ اقبال نے اُردو کی مخالفت کے طوفان، لسانی تعصب کے واقعات اور اُردو ہندی تنازع کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اُردو ہندی تنازع میں اُنھوں نے اُردو کی کُھل کر حمایت کی۔ گاندھی نے اُردو رسم الخط کو قرآن کا رسم الخط قرار دیا اور تعصب کی بنا پر اُردو کو مسترد کر دیا مگر اقبال نے اُردو کی اہمیت کو واضح

کرتے ہوئے فرمایا کہ میری لسانی عصبیت میری مذہبی عصبیت سے کم نہیں ہے۔ اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ خطبۂ اِلٰہ آباد میں بیان کردہ دوقومی نظریے کے پس منظر میں یہی عوامل کارفرما تھے۔ حضرت علامہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ راستہ سمجھایا کہ وہ اُردو کی اہمیت کو سمجھیں کیونکہ یہ ایک زندہ اور وُسعت پذیر زبان ہے۔ ایسا کرنے سے اُن کا شمار زندہ قوموں میں رہے گا۔

علامہ اقبال نے اُردو شاعری میں جہاں اپنے فکر وفن اور فلسفے کو عام کیا وہاں اُردو زبان کی سرپرستی بھی کی، وقار عطا کیا اور اپنی شاعری سے اُسے ثروت مند کیا۔ نئے الفاظ اور اسالیب سے روشناس کرایا۔ تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا استعمال کر کے اُردو کے دامن میں وُسعت پیدا کی۔ الفاظ اور تراکیب کو نئے معانی پہنائے اور شاعری کوفن کے اعتبار سے پختگی کی معراج پر پہنچا دیا۔ علامہ اقبال نے اپنے فکروفن سے ثابت کر دیا کہ اُردو ہی ہندوستان کی قومی زبان بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ اب ہم نے کیا کرنا ہے، ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ آپ حضرات دل کی گہرائی سے سوچیے گا۔

●●●

عصرِ حاضر میں اُردو کی کشتی کو طوفانِ بلاخیز کا سامنا ہے جس کے مقابل چند سر بکف محبانِ اُردو سینہ سپر ہیں جو اصلاحِ زبان کے ساتھ ساتھ دشمنانِ اُردو کے حملوں کا بھرپور علمی اور استدلالی جواب بھی دے رہے ہیں اور اُردو کا مقدمہ اُردو والوں اور اربابِ بست و کشاد کے سامنے پیش بھی کر رہے ہیں۔ دشمنانِ اُردو کے شش جہات حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والوں میں پروفیسر غازی علم الدین کا قلمی جہاد نفاذِ اُردو میں نہ صرف مدد دے گا بلکہ اصلاحِ زبان اور بقائے اُردو کا ضامن بھی ہوگا۔

پروفیسر مشتاق احمد ساقی
شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج میرپور

نام	غازی علم الدین
پیدائش	یکم جنوری ۱۹۵۹ء
فارغ التحصیل	اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور
مصروفیت	تدریس (کلیاتی و جامعاتی سطح پر)
	پرنسپل (ریٹائرڈ)
تحریر و تخلیق کا میدان	لسانیات، تحقیق، تنقید اور ادارت
پتا	مکان نمبر ۲۳، سیکٹر ایف ون، میرپور، آزاد کشمیر
رابطہ	0345-9722331
برقی پتا	prof.ghazilmuddin@gmail.com

تصانیف:

- میثاقِ عمرانی — نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد
- لسانی مطالعے — مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد
- تنقیدی و تجزیاتی زاویے — بزمِ تخلیقِ ادب، کراچی
- تخلیقی زاویے — مثال پبلشرز، فیصل آباد
- لسانی زاویے — مثال پبلشرز، فیصل آباد
- اُردو کا مقدمہ — مثال پبلشرز، فیصل آباد
- میزانِ انتقاد و فکر — مثال پبلشرز، فیصل آباد

Misaal Publishers
misaal.publishers
+92-300-6668284
misaalpb@gmail.com